المحصول

شرح ثلاثة الأصول

1441هـ

تاليف:

فضيلة الشيخ عبد الله محمد الجهني

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد لله حمداً يليق بجلاله وعظمته

وأشهد أن لا إله إلّا الله وحده لا شريك له وأشهد أن محمداً عبده ورسوله، صل اللهم عليه وعلى آله وصحبه أجمعين والتابعين لهم بإحسان إلى يوم الدين ..... أما بعد:

یہ کتاب امام محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کے رسالہ "ثلاثۃ الأصول" کی مختصر شرح ہے۔ میں نے اس میں شیخ رحمہ اللہ کے مقصد کو قارئین تک پہنچانے اور ان کی کچھ عبارتوں کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس شرح میں بہت زیادہ تفصیل میں جانے سے پرہیز کیا ہے، الا یہ کہ اس کی ضرورت ہو۔ اس رسالہ کی ہر بات کی تفصیلی وضاحت کی ضرورت اس لئے بھی نہیں تھی کہ اس کے معنی و مفہوم کے واضح ہونے اور اس کے الفاظ کے سہل و آسان ہونے کی وجہ سے اس کی باتیں سامعین کو بآسانی سمجھ میں آجاتی ہیں۔ اس شرح کو "المحصول في شرح ثلاثة الأصول" کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے میری یہی دعا ہے کہ وہ اسے نفع بخش بنادے اور شیخ رحمہ اللہ کو مسلمانوں کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ وصلّ اللهم على نبينا محمد وعلى آله وصحبه أجمعين

رسالہ کا مختصر تعارف

اس رسالہ کو (الأصول الثلاثۃ) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ نیز اسے (ثلاثۃ الأصول) کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور یہی نام مشہور بھی ہے۔[1]

اس رسالہ میں وہ امور زیر بحث ہیں جن کے بارے میں قبر کے اندر انسان سے سوال ہو گا یعنی یہ کہ تمہارا رب کون ہے، تمہارا دین کیا ہے اور تمہارا نبی کون ہے؟

رسالہ کی چند امتیازی خصوصیات:

1۔ آسان اسلوب: عبارت واضح ہے، جو بات کہی گئی ہے اس کا معنی و مفہوم بالکل واضح ہے۔ ان کی باتوں کی بہت زیادہ تشریح کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اس رسالہ کو مساجد کے اندر عوام الناس کے سامنے پڑھا جاتا تھا تو وہ اس کے مشتملات کو تشریح و وضاحت کے بغیر سمجھ لیتے تھے۔[2]

2۔ حسن تصنیف: اس رسالہ میں ایسے طریقہ کا استعمال کیا گیا ہے جس سے بات کو سمجھنا آسان ہو جائے، مثلاً:

1۔ کچھ لوگوں نے ان دونوں کو الگ الگ دو رسالہ شمار کیا ہے لیکن بظاہر ایسی بات نہیں ہے، اس لئے کہ شیخ کی عادت ہے کہ وہ کسی بھی مضمون پر پوری توجہ مرکوز کرتے ہیں اور قریب المعنی الفاظ کے ذریعہ اسے کئی بار دہراتے ہیں، شیخ رحمہ اللہ کی تصانیف کا مطالعہ کرنے والے کے لئے یہ بات معروف ہے، شیخ کے کلام میں یہ رسالہ ایک سے زائد الفاظ کے ساتھ مذکور ہے، اسی طرح رسالہ القواعد الاربعہ بھی ایک سے زیادہ الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔ ان کے دوسرے رسائل کا بھی یہی حال ہے۔ واللہ اعلم

2۔ شیخ عبد الرحمٰن سعدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ عوام الناس کو تعلیم دینے اور ان کی دینی رہنمائی کا حکیمانہ طریقہ یہ ہے کہ انہیں ان کی ضرورت کے مطابق دین کی باتوں کو ایسے الفاظ و عبارت میں پیش کیا جائے جو ان کے ذہنوں کے قریب ہوں اور ان کے ذہنوں سے ہم آہنگ ہوں۔ یہ طریقہ و اسلوب بہت زیادہ نفع بخش ہے۔

آ۔ پہلے اجمال پھر تفصیل: مصنف رحمہ اللہ کچھ مسائل کو پہلے اجمالی طور پر بیان کرتے ہیں پھر اس کی تفصیل میں جاتے ہیں، مثلاً ان کا یہ قول (اگر آپ سے دریافت کیا جائے کہ وہ تین اصول کیا ہیں جنہیں انسان کے لئے جاننا ضروری ہے؟ تو آپ کہیں: بندہ کا اپنے رب، اپنے دین اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جاننا) اس کے بعد مصنف رحمہ اللہ نے ان تینوں اصولوں کی تفصیل بیان کی ہے۔

اسی طرح مصنف رحمہ اللہ نے دین کے علم کے تعلق سے کہا ہے کہ (اس کے تین درجات ہیں: اسلام، ایمان اور احسان) اس کے بعد وہ ہر درجہ کی تفصیل بیان کرتے ہیں اور اس کے ارکان کو ذکر کرتے ہیں۔

(ب) مصنف رحمہ اللہ اپنی بات کو سوال وجواب کی شکل میں پیش کرتے ہیں: باتوں کو ذہن نشین کرنے کے لئے یہ اسلوب بہت مفید ہے۔ یہ نبوی اسلوب ہے اور اس کا استعمال بہت سی احادیث کے اندر ہوا ہے مثلاً یہ حدیث: "تم لوگ مجھے اس درخت کے بارے میں بتاؤ جو مسلمان شخص کے مشابہ ہے، اس کے پتے نہیں گرتے ہیں۔" (متفق علیہ) نیز یہ حدیث: "کیا تم لوگوں کو معلوم ہے کہ تمہارے رب نے کیا کہا ..... " (متفق علیہ)

(ج) کتاب کی ترتیب اتنی اچھی ہے کہ بتدریج قاری کے ذہن تک رسائی حاصل کرتی ہے مثلاً اصل اول میں رب تعالیٰ کے بارے میں شیخ رحمہ اللہ کا کلام۔ سب سے پہلے انہوں نے رب تعالیٰ کے بارے میں بتایا۔ پھر اس کے عقلی دلائل پیش کئے، پھر اس بات کو لازم قرار دیا کہ تنہا اسی کی عبادت کی جائے گی، پھر عبادات کی اقسام بیان کیں جنہیں صرف اللہ تعالیٰ کے لئے انجام دینا واجب ہے۔

3۔ دلائل کی کثرت: شیخ رحمہ اللہ جس مسئلہ کو بھی ذکر کرتے ہیں تو اس کے بہت سے دلائل بھی بیان کرتے ہیں۔

شیخ رحمہ اللہ کی تقریباً تمام کتابیں ان مذکورہ بالا خصوصیات کی حامل ہیں۔ اسی کی وجہ سے ان کی مبارک دعوت کو برکت اور تقویت حاصل ہوئی۔ خیر وبرکت اور علم و درستگی سب اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیات ہیں۔

رسالہ کے مشتملات

ہم اس مفید رسالہ کو تین حصے میں تقسیم کر سکتے ہیں:

پہلی قسم: وہ حصہ جس میں تین الگ الگ رسالے ہیں۔

دوسری قسم: وہ حصہ جس میں تینوں اصولوں کے بارے میں کلام کیا گیا ہے یعنی (تمہارا رب کون ہے، تمہارا دین کیا ہے اور تمہارا نبی کون ہے)

تیسری قسم: وہ حصہ جس میں مختلف قسم کے مسائل کا بیان ہے مثلاً موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے اور حساب و کتاب کا اثبات، موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کو جھٹلانے والے کے کافر ہونے کا بیان۔ نیز یہ کہ تمام رسل دعوت توحید کے ساتھ مبعوث ہوئے تھے، اللہ کو چھوڑ جن چیزوں کی عبادت کی جاتی ہے ان سب کے معبود ہونے کا انکار اور ان اہم چیزوں کا بیان جن کی اللہ کو چھوڑ کر پرستش کی جاتی ہے۔

تنبیہ: متعدد علماء نے یہ واضح کیا ہے کہ اس رسالہ کے شروع میں جو تین رسائل ہیں وہ مصنف رحمہ اللہ کے ترتیب دیئے ہوئے مستقل رسالے ہیں۔ شیخ رحمہ اللہ کے کسی شاگرد نے ان مستقل رسالوں کو اس رسالہ کے شروع میں شامل کر دیا ہے۔

شیخ عبد المحسن قاسم حفظہ اللہ نے شیخ رحمہ اللہ کے قول (اگر تم سے دریافت کیا جائے کہ اصول ثلاثہ سے کیا مراد ہے؟) کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے: یہاں سے رسالہ "ثلاثۃ الأصول" کا آغاز ہوتا ہے اور اس سے پہلے جو شیخ رحمہ اللہ کے مختلف رسالے ہیں انہیں شیخ کے کسی شاگرد نے بطور مقدمہ "رسالۃ ثلاثۃ الأصول" سے پہلے شامل کر دیا ہے۔ مجھے یہ بات میرے والد اور شیخ صالح بن عضون رحمہ اللہ نے بتائی ہے۔ شیخ عبد المحسن قاسم کی بات ختم ہوئی۔

ایسا ہونا ممکن ہے اور یہی بات صحت سے زیادہ قریب بھی ہے، کیونکہ شیخ رحمہ اللہ نے اپنی تصنیفات میں ان تینوں اصولوں پر علاحدہ طور پر بھی کلام کیا ہے۔ وہیں سے وہ اپنی بات شروع کرتے ہیں مثلاً وہ اپنے ایک رسالہ کا آغاز ان الفاظ کے

ساتھ کرتے ہیں:(بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے تین اصولوں کو جاننا ضروری ہے یعنی رب کون ہے، دین کیا ہے اور نبی کون ہیں۔ بحوالہ اصل اول.....) شیخ رحمہ اللہ اپنے ایک دوسرے رسالہ کا آغاز اس طرح کرتے ہیں (بسم اللہ الرحمٰن الرحیم: جب تم سے کہا جائے کہ تمہارا رب کون ہے.....) اسی طرح تینوں رسائل الگ الگ بھی نقل کئے گئے ہیں، ہر مسئلہ علاحدہ طور پر بھی بیان کیا گیا ہے اور کچھ مسائل متعدد الفاظ میں بیان ہوئے ہیں۔ واللہ أعلم

بسم الله الرحمن الرحيم

اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے، آپ یہ بات جان لیں کہ ہمارے لئے چار مسائل کو جاننا واجب ہے:

پہلا مسئلہ: علم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کو جاننا، اس کے نبی کو جاننا اور دلائل کے ذریعہ دین اسلام کو جاننا۔

دوسرا مسئلہ: ان باتوں پر عمل کرنا۔

تیسرا مسئلہ: ان باتوں کی دعوت دینا۔

چوتھا مسئلہ: اس راہ میں اذیت وتکلیف پر صبر کرنا۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم "والعصر إن الإنسان لفي خسر إلّا الذين آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر" (زمانے کی قسم، بیشک (بالیقین) انسان سر تا سر نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور (جنہوں نے) آپس میں حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی)

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ہے: اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے خلاف اس سورہ کے علاوہ کوئی اور حجت نہیں اتاری ہوتی تب بھی یہ ان کے لئے کافی تھی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے: باب: قول وعمل سے پہلے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "فاعلم أنه لا إله إلا الله واستغفر لذنبك" (سو (اے نبی!) آپ یقین کر لیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے گناہوں کی بخشش مانگا کریں) اس آیت میں بھی قول و عمل سے پہلے علم کا تذکرہ ہے۔

یہ مصنف رحمہ اللہ کا پہلا رسالہ ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ بالا چاروں مسائل کا علم ہونا ضروری ہے۔ شیخ رحمہ اللہ نے اس کی دلیل بھی ذکر کر دی ہے۔

مصنف کا قول [بسم اللہ الرحمن الرحیم]

علماء میں سے اہل تصانیف کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اپنی تصانیف کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرتے ہیں اور اس کی یہ چند وجوہات ہیں:

1۔ اللہ عزوجل کی کتاب کی اقتداء کرتے ہوئے، کیونکہ کتاب اللہ کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوا ہے۔

2۔ رسولوں کی سنت پر عمل کرتے ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بسم اللہ الرحمن الرحیم سے اپنے مکاتیب کا آغاز فرماتے تھے۔

3۔ یہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل ہے۔ اس کی مثال صحیح بخاری کی یہ روایت ہے۔ ثمامہ بن عبد اللہ بن انیس بیان کرتے ہیں کہ انس رضی اللہ عنہ نے ان سے بیان کیا کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے ان کو بحرین روانہ کرتے وقت ان کے لئے یہ تحریر لکھی تھی: (بسم اللہ الرحمن الرحیم: یہ فریضۂ صدقہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر فرض کیا ہے....) اس کے بعد صدقہ کی مقدار کو ذکر کیا۔

4۔ یہ کتابوں کی تالیف میں علماء کا طریقہ بھی ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ دینی کتابوں کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع کرنا ائمہ مصنفین کا طرز عمل رہا ہے۔ رسائل کی بیشتر کتابوں میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ ابن حجر رحمہ اللہ کی بات ختم ہوئی۔

رہی یہ حدیث (كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه ببسم الله الرحمن الرحيم فهو أبتر) (ہر وہ اہم کام جس کے آغاز میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں پڑھا جاتا وہ ناقص ہے) شیخ البانی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو بہت زیادہ ضعیف کہا ہے۔[1] اسی طرح ایک اور حدیث ہے (كل أمر ذي بال لا يبدأ فيه بالحمد لله فهو أقطع) (ہر وہ اہم کام جس کا آغاز اللہ کی حمد سے نہیں کیا جاتا ہے تو وہ ناقص و ناتمام ہے) ایک روایت میں (بحمد اللہ) آیا ہے، ایک روایت میں (بالحمد) آیا ہے اور ایک روایت میں (فهو أجزم) آیا ہے۔ شیخ البانی نے اس روایت کو بھی ضعیف کہا ہے۔ دیکھئے: إرواء الغليل (1/29)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [آپ یہ جان لیجئے]

یہ کلمہ اہم چیزوں کو ذکر کرنے سے پہلے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ سننے والے یا پڑھنے والے کو آگے ذکر کی جانے والی اہم بات کی طرف توجہ مبذول کرنے کے لئے متنبہ کیا جاتا ہے۔

شیخ حافظ حکمی معارج القبول میں کہتے ہیں: (آپ جان لیجئے) ایک ایسا کلمہ ہے جسے اہتمام کے اظہار اور بعد میں ذکر کی جانے والی باتوں پر غور و فکر کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ حافظ حکمی کی بات ختم ہوئی۔

مصنف رحمہ اللہ نے دین کے جن اصولوں کو بیان کیا ہے وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ ان کا غایت درجہ اہتمام کیا جائے۔ یہ بات ابن قاسم نے اپنے حاشیہ میں کہی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اللہ آپ پر رحم کرے]

یہ جملہ خبر یہ ہے۔ اس کا مقصد پڑھنے والے اور سننے والے کو یہ دعا دینا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر دنیا و آخرت میں رحم کرے گا۔

---

[1] ابن صلاح اور نووی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

شیخ محمد بن ابراہیم کہتے ہیں: مصنف رحمہ اللہ اکثر و بیشتر اپنی باتوں کو بیان کرنے ساتھ طالب علم کے لئے دعائیہ کلمات استعمال کرتے ہیں۔ یہ ان کا بہترین طریقہ اور مسلمانوں کے ساتھ محبت و رحمدلی کا اظہار ہے۔ شیخ محمد بن ابراہیم کی بات ختم ہوئی۔

یہ ایک عمدہ دعوتی اسلوب ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں:

1۔ لفظی پہلو: داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی گفتگو کے لئے مناسب الفاظ کا استعمال کرے جو دعوت کے لئے مدعو کے دل کو کھول دے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اے معاذ! اللہ کی قسم میں تم سے محبت کرتا ہوں، اللہ کی قسم میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اے معاذ! میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ تم ہر نماز کے بعد اس دعا کو پڑھنا کسی حال میں ترک نہ کرو "اللهم أعني على ذكرك وشكرك وحسن عبادتك" (اے اللہ! میری مدد فرما کہ میں تیرا ذکر کروں، تیرا شکر ادا کروں اور اچھی طرح تیری عبادت کروں) اس روایت کو امام احمد، امام ابو داؤد اور امام نسائی نے نقل کیا ہے۔ شیخ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے فرمایا: "عبد اللہ بہت اچھا آدمی ہے، اگر وہ رات میں نماز پڑھتا ہو۔" (متفق علیہ) اس کے علاوہ دوسری حدیثیں بھی ہیں۔

2۔ مقصد کا پہلو: داعی کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس کا مقصد لوگوں کو جہنم کی آگ سے بچانا ہو اور وہ لوگوں کی بہت زیادہ خیر و بھلائی چاہنے والا ہو۔

انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ بیمار ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سر کے پاس بیٹھ گئے اور اس سے فرمایا، تم اسلام قبول کر لو۔ اس لڑکے نے اپنے والد کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جو اس کے پاس موجود تھا۔ اس کے والد نے کہا: تم ابو القاسم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بات مان لو۔ اس کے بعد وہ لڑکا مسلمان ہو گیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہوئے: ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے اسے جہنم کی آگ سے بچا لیا۔" (صحیح بخاری)

یہاں اہم سوال یہی ہے کہ وہ لڑکا جو بستر مرگ پر تھا اسے اسلام کا کلمہ پڑھوا کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیا فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے؟ آپ نے اسے اس لئے اسلام کا کلمہ پڑھوایا تاکہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو یا جہاد، دعوت یا تعلیم کے میدان میں اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے ایسا کیا یا اس کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد تھا۔

اس سوال کا جواب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جملہ ہے (ہر قسم کی تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جس نے اس لڑکے کو جہنم کی آگ سے بچالیا) داعی کے دعوتی کاز کا بنیادی مقصد یہی ہے۔

مصنف کا قول [چار مسائل کو جاننا ہمارے اوپر واجب ہے]

اس وجوب کی دلیل سورۃ العصر ہے جسے مصنف رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے۔ اس سورۃ سے یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ تمام انسان خسارے میں ہیں سوائے اس کے جس نے سورہ میں مذکور چار کاموں کو خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [پہلا مسئلہ علم ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو جاننا، اس کے نبی کو جاننا اور دلائل کے ذریعہ دین اسلام کو جاننا] [1]

یہاں علم سے مراد علم شرعی ہے یعنی ہر وہ علم جس کی قرآن وسنت میں تعریف کی گئی ہے اور جس علم کو حاصل کرنے والے کی توصیف کی گئی ہے، لہذا اس سے شرعی علم مراد ہے۔

شاطبی نے الاعتصام میں لکھا ہے: شریعتوں کے حاملین کا اس پر اتفاق ہے کہ شرعی علوم دیگر تمام علوم سے افضل ہیں اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ اجر وثواب کا باعث ہوں گے۔

---

[1] مصنف رحمہ اللہ نے یہاں علم کو معرفت سے تعبیر کیا ہے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ علم معرفت کا مترادف ہے یا نہیں اور اللہ تعالیٰ کے لئے معرفت کا استعمال صحیح ہے یا نہیں۔ ابن قیم نے مدارج السالکین میں علم اور معرفت کے درمیان لفظی اور معنوی فرق کو واضح کیا ہے۔ علم کی تعریف میں علماء کی عبارتیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ابن حجر نے فتح الباری میں کہا ہے کہ ابن العربی نے سنن ترمذی کی شرح میں علم کی تعریف کرنے والوں پر نکیر کی ہے اور کہا ہے کہ علم بہت واضح چیز ہے، اسے واضح کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یہ غزالی اور ان کے شیخ امام کا طریقہ ہے جو یہ کہتے ہیں کہ بہت واضح ہونے یا بہت مشکل ہونے کی وجہ سے علم کی تعریف نہیں کی جاسکتی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ اپنے کسی رسالہ میں کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے، آپ یہ بات جان لیں کہ علم حاصل کرنا فرض ہے، یہ بیمار دلوں کے لئے شفاء ہے۔ بندہ کے لئے سب سے اہم بات دین کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ دین کی معرفت اور اس پر عمل جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اور دین سے ناواقفیت اور اسے ضائع کرنا جہنم میں داخل ہونے کا سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے ہم لوگوں کو اپنی پناہ میں رکھے۔ مصنف رحمہ اللہ کی بات ختم ہوئی۔

شرعی علم سب سے بڑی عبادت اور اللہ تعالیٰ کی قربت کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔ زہری کا قول ہے: علم ان ساری چیزوں میں سب سے افضل ہے جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جاتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے اسے دین کا تفقہ عطا کرتا ہے۔ (متفق علیہ)

لہذا علم ہدایت کی طرح ہے۔ اللہ عزوجل اپنے جس بندہ کو چاہتا ہے اس کی توفیق عطا فرماتا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں:

والعلم يدخل قلب كل موفق　　من غير بواب ولا استئذان

ويرده المحروم من خذلانه　　لا تشقنا اللهم بالخذلان

(علم ہر باتوفیق انسان کے دل میں داخل ہوتا ہے جسے نہ کسی کی اجازت کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ کوئی دربان اسے روکتا ہے۔ توفیق الٰہی سے محروم انسان اللہ کی مدد شامل حال نہ ہونے کی وجہ سے علم کو واپس کر دیتا ہے۔ اے اللہ! تو ہمیں اپنی مدد سے محروم کر کے شقاوت وبد بختی سے ہمکنار نہ کر)

علم کا حصول سب سے نفیس کام ہے جس میں بندہ مشغول ہوتا ہے۔ سفیان ثوری سے دریافت کیا گیا: آپ کب تک حدیث کا علم حاصل کریں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حدیث جمع کرنے سے بڑھ کر بھی اگر کوئی خیر کا کام ہو تو بتاؤ میں اس کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔

رجبی اپنی نظم "الرجبیۃ" میں کہتے ہیں: یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ بندہ جن کاموں کے لئے کوشش کرتا ہے اور اسے جن کاموں کی طرف بلایا جاتا ہے ان میں سب سے بہتر اور ترجیح یافتہ علم ہے۔

علم دینداری اور قربت الٰہی کے لئے حاصل کرنا چاہئے۔ علم کو معلومات کے لئے یا بطور پیشہ یا اضافہ و کثرت کے لئے یا مجالس میں اپنی شخصیت کی تزئین کے لئے نہیں حاصل کرنا چاہئے۔ سفیان ثوری کا قول ہے: تم اپنی ذات کے ذریعہ علم کو زینت بخشو اور علم کے ذریعہ اپنی ذات کو مزین نہ کرو۔

حبیب بن عبید کا قول ہے: تم لوگ علم سیکھو، اس کو سمجھو، اس سے فائدہ اٹھاؤ، تم اپنی شخصیت کو خوبصورت بنانے کے لئے علم حاصل نہ کرو۔ اگر تمہاری عمریں لمبی ہوئیں تو عنقریب تم دیکھو گے کہ علم کے ذریعہ اسی طرح زینت اختیار کیا جائے گا جیسے انسان کپڑے پہن کر زینت اختیار کرتا ہے۔

انسان علم حاصل کرنے کی وجہ سے فتنے سے محفوظ رہتا ہے، خاص طور پر اس وقت جبکہ فتنے کی وجہ سے معاملات مشتبہ ہو کر رہ جائیں۔ علم والا انسان بصیرت و ہدایت کا حامل ہوتا ہے۔ اس کے لئے معاملات گڈمڈ نہیں ہوتے- وہ فتنے کی موج میں نہیں پڑتا جو لوگوں کے دائیں بائیں برپا ہوتے رہتے ہیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: ٹھوس اور راسخ علم والوں کا حال یہ ہے کہ اگر ان کے سامنے شبہات سمندر کی موجوں کی تعداد میں آتے ہیں تب بھی اس کے یقین کو متزلزل نہیں کر پاتے ہیں، نہ اس کے یقین کے اندر شک کے بیج بونے میں کامیاب ہو پاتے ہیں، اس لئے کہ اس کا علم ٹھوس اور راسخ ہے، لہذا اسے شبہات ڈانواڈول نہیں کر پاتے، بلکہ جب بھی ان پر شبہات کا حملہ ہوتا ہے تو علم کے چوکیدار اور لشکر انہیں بیڑیوں میں جکڑ کے اور مغلوب کر کے واپس لوٹا دیتے ہیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ نے کتنی خوبصورت بات کہی ہے۔ دنیا کی ویرانی کا سبب صرف جہالت ہے اور اسے صرف علم کے ذریعہ ہی آباد کیا جا سکتا ہے۔ جب کسی شہر یا محلہ میں علم کا ظہور ہوتا ہے تو وہاں کے لوگوں کے اندر شر کم ہو جاتا ہے اور جس آبادی میں علم روپوش ہو جاتا ہے وہاں شر و فساد ظاہر ہوتا ہے۔

اگر علم اور اہل علم کی فضیلت پر گفتگو کی جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ اس کی مزید تفصیل اس موضوع سے متعلق کتابوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ علمائے متقدمین اور متاخرین نے اپنی مستقل تصانیف میں اس موضوع کو بیان کیا ہے۔

مسئلہ: مصنف رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ حصول علم واجب ہے، اس سے ان کی مراد شرعی علم ہے۔ حق یہ ہے کہ شرعی علم کا ایک حصہ وہ ہے جسے حاصل کرنا واجب ہے، اگر کوئی شخص اس سے غافل و ناواقف رہتا ہے تو وہ گنہگار ہو گا۔ شرعی

علم کا ایک حصہ وہ ہے جسے حاصل کرنا مستحب اور فرض کفایہ ہے۔ کسی نے اسے سیکھ لیا تو اچھا ہے اور اسے ترک کر دینے کی وجہ سے وہ گنہگار نہیں ہو گا جبکہ اسے کسی ایسے آدمی نے سیکھ لیا ہو جس سے فرض کفایہ ادا ہو جاتا ہو۔

علم واجب کا ضابطہ: ہر وہ علم جس کے بغیر واجب کی ادائیگی ممکن نہ ہو۔

امام احمد رحمہ اللہ کہتے ہیں: اتنا علم حاصل کرنا واجب ہے جس کی مدد سے وہ اپنے دین پر عمل کر سکے۔ ان سے دریافت کیا گیا: اس کی کیا مثال ہو سکتی ہے؟ انہوں نے کہا: مثلاً وہ علم جس سے غافل و ناواقف رہنے کی گنجائش نہ ہو جیسے نماز اور روزے کے مسائل اور اسی قبیل کے دیگر دینی امور۔ امام احمد کی بات ختم ہوئی۔

علم کی تحصیل کا حکم اشخاص کے مختلف ہونے کی وجہ سے مختلف ہو گا۔ کسی دینی علم کو حاصل کرنا ایک شخص کے لئے واجب ہو گا جبکہ دوسرے شخص کے لئے واجب نہیں ہو گا، مثلاً فقیر و محتاج انسان کے لئے زکاۃ، حج اور خرید و فروخت کے بہت سے احکام کا علم حاصل کرنا واجب نہیں ہو گا۔

اس بنیاد پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مصنف رحمہ اللہ نے جو بیان کیا ہے کہ علم سے مراد (اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور دلائل کے ذریعہ دین اسلام کو جاننا ہے) تو اس علم کا حصول واجب العین ہے، بلکہ یہ واجبات میں سر فہرست ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی إن شاء اللہ۔[1]

---

[1] ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاستقامہ" میں علم سیکھنے کی قسموں کو بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: ایک علم وہ ہے جس کی کسی بھی قسم کو اور نہ بعینہ اس علم کو کسی کو سیکھنے کے لئے کہا جائے گا، یا تو اس وجہ سے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اس لئے کہ یہ علم اس علم کے حصول کی راہ میں رکاوٹ ہے جو مفید ہے۔ اگر وہ علم نقصاندہ ہو تو اسے سیکھنے سے روکا جائے گا، اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ ایسے علم ہیں عقل انسانی جس کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے لہذا اس سے نقصان ہو گا، جیسا کہ علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا قول ہے: لوگوں سے وہ باتیں بیان کرو جنہیں وہ سمجھتے ہوں، ان باتوں کو بیان نہ کرو جن سے وہ نامانوس ہوں۔ کیا تم چاہو گے کہ اللہ اور اس کے رسول کی تکذیب کی جائے۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے: کوئی شخص کسی جماعت کے سامنے ایسی بات بیان کرتا ہے جو ان کی عقل سے پرے ہے تو ایسی بات کچھ لوگوں کے لئے فتنہ بن جائے گی۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فائدہ: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ (سنن ابن ماجہ) وغیرہ۔ اس حدیث کی بہت سی سندیں ہیں لیکن کوئی بھی سند کلام سے خالی نہیں ہے۔

ابن عبد البر کہتے ہیں: یہ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً بہت سی سندوں سے نقل کی گئی ہے لیکن ساری سندیں معلول ہیں، محدثین کے نزدیک ان میں سے کوئی بھی سند قابل حجت نہیں ہے۔

= ایک کلام وہ ہے جسے علم کہا جاتا ہے حالانکہ وہ جہالت ہے مثلاً فلسفیوں کے علوم، اہل کلام کی باتیں، موضوع احادیث، تقلید فاسد اور ستاروں کے احکام۔ اسی لئے یہ بات کہی جاتی ہے کہ کچھ باتیں جنہیں علم کہا جاتا ہے وہ جہالت ہیں، کچھ اقوال ایسے ناقابل فہم ہوتے ہیں کہ انہیں بولنا اور نہ بولنا دونوں برابر ہے اور کچھ باتوں میں جادو جیسی اثر انگیزی ہوتی ہے۔

کچھ علم کچھ لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں کیونکہ برے مقاصد کی تکمیل کے لئے اس علم سے مدد لی جاتی ہے۔ اس صورت میں وہ علم حربی کافر کے ہتھیار اور فاجر کے مال کی طرح ہو جاتا ہے۔ کچھ علم وہ ہیں جن کا عام انسانوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے مثلاً فلکیاتی نظام کی باریکیوں، اس کے ثوابت و توابع اور ہر ستاروں کی حرکت کا علم۔ یہ ہمارے نزدیک تغیر و تبدیلی کی حرکتوں کے درجہ میں ہے۔

کچھ علم وہ ہیں جو انسان کو ان علوم کی تحصیل سے روک دیتے ہیں جن کی اسے ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کو کچھ علوم اور کچھ واجبی کاموں کی ضرورت ہوتی ہے، پھر جب وہ ضرورت کے علوم کو چھوڑ کر غیر ضروری علم میں مشغول ہو جاتا ہے تو اس کا یہ عمل قابل مذمت ہوتا ہے۔

ان ہی وجوہات کی بناء پر کچھ علم کو مذموم کہا جاتا ہے کیونکہ وہ حقیقت میں علم ہی نہیں ہیں، اگرچہ اس علم کے حاملین اور دوسرے لوگ اسے علم کہتے ہوں۔ اس کی مثالیں بکثرت موجود ہیں۔

ایک علم وہ ہے جس کی تحصیل سے انسان عاجز و بے بس ہو یا وہ علم اسے نقصان کی طرف لے جاتا ہو یا نقصان دہ کام کرنے میں مددگار بنتا ہو یا نفع بخش کاموں کو انجام دینے سے روکتا ہو۔

ایک علم وہ ہے جو انسان کے حق میں نہ قابل تعریف ہے نہ مذموم۔ یہ ساری علم کی قسمیں ہیں۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی بات ختم ہوئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اے اللہ! میں اس علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو نفع بخش نہ ہو" (صحیح مسلم) ابن رجب اپنی کتاب "فضل علم السلف علی الخلف" میں کہتے ہیں: نفع بخش علم وہ ہے جو بندہ کو رب کا عرفان عطا کر دے۔

کچھ اہل علم نے اس کی تمام سندوں کو سامنے رکھ کر اسے حسن کہا ہے۔ شیخ البانی کہتے ہیں: اس حدیث کی سندیں ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں بلکہ ان میں سے ایک سند حسن ہے۔ میرے نزدیک یہ حدیث تمام سندوں کو اکٹھا کرنے سے بلا شک وشبہ صحیح قرار پاتی ہے۔

تنبیہ: سخاوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: کچھ مصنفین نے اس حدیث کے آخر میں (ومسلمۃ) کا اضافہ کیا ہے۔ اس حدیث کی کسی سند میں یہ لفظ مذکور نہیں ہے، اگرچہ اس کا مفہوم صحیح ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [دوسرا مسئلہ: جو علم حاصل کیا اس پر عمل ہے]

عمل علم کا پھل ہے۔ جو علم سیکھتا ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتا ہے وہ فتنہ کا شکار ٹھگا ہوا انسان ہے۔

نفع بخش علم وہ ہے جس کا پھل عمل کی شکل میں سامنے آئے ورنہ وہ علم صاحب علم کے لئے وبال جان ہو گا۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: علم بلا عمل اگر نقصان نہ بھی پہنچائے تب بھی اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

شیخ حمد بن عتیق کہتے ہیں: علم بلا عمل ایسے ہی ہے جیسے پھل کے بغیر درخت۔ ایسا علم قیامت کے دن صاحب علم کے خلاف حجت ہو گا۔

ہمارے شیخ ابن عثیمین[1] رحمہ اللہ کتاب التوحید کی شرح میں رقمطراز ہیں: غیر نفع بخش علم کا نقصان جہالت کے نقصان سے زیادہ بڑا ہے۔

عمل کے تعلق سے جو بات بندہ کو سب سے زیادہ ڈراتی ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: "قیامت کے دن کسی بندہ کا قدم اس وقت تک نہیں ہلے گا جب تک کہ اس سے اس کی عمر کے بارے میں دریافت نہ کر لیا جائے کہ اسے کن کاموں میں ختم کیا، اس سے اس کے علم کے بارے میں سوال ہو گا کہ اس پر کتنا عمل کیا، اس سے اس کے مال کے بارے میں

---

1. جب میں کہوں (ہمارے شیخ) تو اس سے ہمارے شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ مراد ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں میری طرف سے اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین بدلہ عنایت فرمائے اور ہمارے ذریعہ جو کچھ بھی علم دین کی اشاعت ہو رہی ہے اسے ان کی نیکیوں کی فہرست میں شامل کر دے۔

سوال ہو گا کہ کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا، اس سے اس کے جسم کے بارے میں سوال ہو گا کہ اسے کن کاموں میں بوسیدہ کیا۔" یہ روایت سنن ترمذی کی ہے۔ امام ترمذی کے بقول: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ شیخ البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔

ہمارے شیخ کہتے ہیں: عمل در حقیقت علم کا پھل ہے۔ جس نے بغیر علم کے عمل کیا وہ نصاریٰ کے مشابہ ہے اور جس نے علم کے باوجود عمل نہیں کیا وہ یہود کے مشابہ ہے۔

سلف رحمہم اللہ علم کی عمل کے ذریعہ حفاظت کرتے تھے۔ سلف میں سے کسی کا قول ہے: ہم حدیث کو یاد کرنے کے لئے اس پر عمل کے ذریعہ مدد حاصل کرتے تھے۔

ایک قول یہ ہے کہ علم عمل کے لئے آواز لگاتا ہے، اگر اس کی پکار سن لی گئی تو ٹھیک ورنہ وہ رخصت ہو جاتا ہے۔

علم پر عمل کرنے سے بندہ کو دوسرے علوم حاصل ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "والذین اھتدوا زادھم ھدی وآتاھم تقواھا" (اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ نے انہیں ہدایت میں اور بڑھا دیا ہے اور انہیں ان کی پرہیز گاری عطا فرمائی ہے)

کسی اہل علم کا قول ہے: جس نے اپنے علم پر عمل کیا اللہ تعالیٰ اسے وہ علم عطا کرتا ہے جو اس کے پاس نہیں تھا اور جس نے اپنے علم پر عمل نہیں کیا قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے علم کو سلب کر لے۔

عمل کرنے والے عالم کی پند و نصیحت دلوں تک پہنچتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے کلام سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے، اگرچہ وہ کم اور معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ عمل نہ کرنے والے کی نصیحت کانوں سے آگے نہیں بڑھتی ہے، اگرچہ وہ کتنے ہی خوبصورت لب ولہجہ میں اپنی بات کہے۔

مالک بن دینار کا قول ہے: جب عالم اپنے علم پر خود ہی عامل نہیں ہوتا ہے تو اس کی نصیحت دلوں سے پھسل جاتی ہے جیسے بارش صفا پہاڑی سے پھسل جاتی ہے۔

فضیل رحمہ اللہ نے کتنی عمدہ بات کہی ہے: عالم جاہل ہی ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے علم پر عمل پیرا ہو جائے۔ جب وہ اپنے علم پر عمل کرتا ہے تب وہ عالم کے زمرہ میں شامل ہوتا ہے۔

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب (اقتضاء العلم والعمل) میں اپنی سند سے شعبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہم لوگ فقہاء نہیں ہیں۔ ہم نے صرف حدیث سنی اور اس کی روایت کی ہے۔ فقہاء وہ لوگ ہیں جو حصول علم کے بعد اس پر عمل کرتے ہیں۔

بندہ کو علم کی پوری لذت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ اس پر عمل کرتا ہے۔ عون بن عبد اللہ کا قول ہے: جب علم سے بہت کم فائدہ حاصل کیا جاتا ہے تو اس سے انسان کے اندر حصول علم کو ترک کرنے کا مزاج بنتا ہے۔ عمل سے خالی علم صاحب علم کے لئے باعث شرمندگی و خذلان ہوتا ہے، چاہے کچھ مدت کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

کچھ اساتذہ اپنے شاگردوں کو یہ وصیت کیا کرتے تھے کہ یہ علم تمہارے لئے شقاوت و بد بختی کا باعث نہ بن جائے۔ یہ بہت بڑی بات ہے، اس کے معنی و مفہوم میں بہت گہرائی ہے۔ علم کبھی صاحب علم کے لئے بد بختی کا باعث تب بنتا ہے جب وہ حیلے بہانے کا سہارا لے کر واضح احکامات و منہیات کی خلاف ورزی کرنے لگتا ہے اور رخصتوں کے چکر میں پڑا رہتا ہے۔ کبھی علم صاحب علم کے لئے بد بختی کا سبب تب بنتا ہے جب اسے دنیا والوں کے سامنے اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ وہ دین کے معاملے میں فتنہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کبھی علم اس کے لئے بد بختی کا سبب تب بنتا ہے جب وہ اس کے ذریعہ دوسروں پر حاوی ہونے، دوسروں کے سامنے فخر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور خود پسندی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی آفتیں ہیں جن سے وہ دوچار ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کے حق میں علم سے بہتر جہالت ہے۔ اسی وجہ سے جس کے لئے علم کا دروازہ کھول دیا جائے اسے اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دعا کرنی چاہئے کہ وہ اس کے لئے عمل کا دروازہ بھی کھول دے۔ اس کے ذریعہ ہی اسے دارین کی سعادت حاصل ہوگی۔

اب میں آپ کے لئے عمل کے تعلق سے سلف کے کچھ مفید اقوال پیش کر رہا ہوں:

سفیان ثوری کہتے ہیں: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بھی حدیث مجھ تک پہنچی میں نے اس پر عمل کیا، اگرچہ ایک ہی مرتبہ کیوں نہ ہو۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کہتے ہیں: میں نے جو بھی حدیث لکھی میں نے اس پر عمل کیا۔

ابراہیم حربی کا قول ہے: انسان کو چاہئے کہ جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب سے متعلق کوئی بات سنے تو اسے مضبوطی کے ساتھ تھام لے۔

امام مالک کہتے ہیں: علم دین کے حاملین پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ اس کے اندر وقار، سنجیدگی اور خشیت ہو۔

سلف میں سے کسی کا قول ہے: جسے ایسا علم دیا گیا جو اسے نہیں رلاتا ہے اندیشہ ہے کہ اسے دیا گیا علم نفع بخش علم نہیں ہے۔

ذہبی کہتے ہیں: اگر میں دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص کوشش و محنت سے علم حاصل کر رہا ہے لیکن نیکی کے کاموں میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے تو ایسا شخص میری نگاہ میں سست اور کمتر ہے، وہ حسن نیت میں سچا نہیں ہے۔

شیخ مجدد محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کے عمدہ اور پر کشش کلام میں سے یہ ہے: جب اللہ تعالیٰ بندہ کو کسی بات کا حکم دیتا ہے تو وہ اس پر سات درجات میں واجب ہوتا ہے: پہلا درجہ یہ ہے کہ اسے اس بات کا علم ہو، دوسرا یہ کہ اسے اس حکم الٰہی سے محبت ہو، تیسرا یہ کہ اس حکم الٰہی کو بجالانے کا وہ عزم کرے، چوتھا یہ کہ وہ اس پر عمل پیرا ہو، پانچواں یہ کہ وہ اسے مشروع طریقہ سے اخلاص کے ساتھ انجام دے، چھٹا یہ کہ ایسے برے و نامناسب کام سے بچے جس کی وجہ سے اس عمل کا ثواب ضائع ہو جائے اور ساتواں یہ کہ اس پر ثابت قدم رہے اور مسلسل عمل کرے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اس کی طرف دعوت دے]

علم اور عمل کے ذریعہ خود کو مکمل کر لینے کے بعد انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو مکمل کرنے کی کوشش کرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔" (متفق علیہ)

محمد بن قاسم کہتے ہیں: جب ہم امام مالک رحمہ اللہ کے پاس سے رخصت ہوتے تو وہ ہمیں کہتے: اللہ سے ڈرنا، اس علم دین کی نشر و اشاعت میں لگے رہنا، اسے دوسروں کو سکھانا اور اسے چھپانے کی کوشش نہ کرنا۔

دارمی نے اپنی سنن میں زہری کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ہمارے پیشرو علماء کہتے تھے: علم دین کی نشر و اشاعت میں دین و دنیا کا استحکام ہے اور علم کو ضائع کرنے سے دین و دنیا دونوں کے ضائع ہونے کا خدشہ ہے۔

عبد اللہ بن مبارک کا قول ہے: جس نے علم کے معاملہ میں بخالت سے کام لیا وہ تین طرح کی آزمائشوں میں سے کسی ایک آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے یا تو وہ جلد ہی مر جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کا علم بھی رخصت ہو جاتا ہے یا وہ اپنے علم کو بھلا دیتا ہے یا وہ سلطان وقت کی بے جا تائید و حمایت میں لگ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف لوگوں کو دعوت دینا بہت بلند مقام و مرتبہ پر فائز ہونا ہے، اس لئے کہ یہ انبیاء اور رسولوں کا مقام و مرتبہ ہے۔

دعوت کا کام کس قدر بلند حیثیت کا حامل ہے اس کا اندازہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے لگایا جا سکتا ہے: "ومن أحسن قولا ممن دعا إلى الله "(اور اس سے اچھی بات والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے)یعنی کوئی نہیں ہے۔

صحیحین میں منقول ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے فرمایا: "اللہ کی قسم اگر اللہ تعالیٰ تمہارے ذریعہ ایک آدمی کو راہ ہدایت پر چلادے تو یہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اس امت کے خیر ہونے کو دعوت الی اللہ سے جوڑ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر "(تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لئے پیدا کی گئی ہے کہ تم نیک باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو)

اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے، بھلائی کا حکم کرنے اور برائی سے روکنے کی وجہ سے امت کی حفاظت ہوتی ہے۔ یہ اسی طرح ہے جیسے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے امت کو عزت و سربلندی حاصل ہوتی ہے۔

دعوت کا سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف لوگوں کو بلایا جائے۔ ہر نبی نے دعوت توحید ہی سے اپنی دعوت کا آغاز کیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دس سال تک مکہ میں رہ کر لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دیتے رہے، پھر نماز کی فرضیت ہوئی اور باقی فرائض کے بارے میں احکام نازل ہوئے۔ جو دعوت منہاج نبوت کے مطابق نہیں ہوگی اس کا انجام ناکامی اور خسارہ ہے۔

یہ ضروری ہے کہ دعوت دینے سے پہلے جس بات کی دعوت دینے جا رہا ہے اس کا علم حاصل کرے اور اسلوب دعوت کا فہم حاصل کرلے ورنہ دعوت دینے والا اصلاح سے زیادہ فساد و بگاڑ کا سبب بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد فرمایا: "قل هذه سبيلي أدعو إلى الله على بصيرة أنا ومن اتبعني "(آپ کہہ دیجئے میری راہ یہی ہے۔ میں اور میرے متبعین اللہ کی طرف بلا رہے ہیں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ)

داعی الی اللہ کے لئے اپنے دعوتی عمل میں اخلاص کو لازم پکڑنا ضروری ہے، اس لئے کہ بندوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ داعی کے دل کی سچائی کو دیکھے گا تو اس کی دعوت میں برکت عطا کرے گا اور اس کی دعوت کو قبول کرنے کے لئے بندوں کے دلوں کو کھول دے گا۔

داعی الی اللہ کے لئے یہ بات بھی اہم ہے کہ اسے دعوت قبول کرنے والوں کی کثرت تعداد کی فکر نہ ہو بلکہ صحیح منہج کے مطابق لوگوں کو دعوت دینا اس کی فکر کا محور ہو، اگرچہ اس کی دعوت کو قبول کرنے والوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ قیامت کے دن کوئی نبی ایسے ہوں گے جن کے ساتھ ایک یا دو افراد ہوں گے اور کسی نبی کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہو گا۔ (متفق علیہ)

داعی کے لئے سب سے اہم بات یہ ہے کہ دعوت کے بدلہ کسی دنیاوی مقصد کا حصول اس کے پیش نظر نہ ہو، چاہے وہ مال و منصب ہو یا شہرت و بلندی ہو یا ان کے علاوہ کوئی اور دنیاوی مفاد ہو۔ اگر وہ دعوت کے بدلہ ان میں سے کسی بھی چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال دے گا۔

اللہ کے رسولوں میں بڑے بڑے دعاۃ اپنی قوم کو دعوت سے پہلے یہ واضح کر دیتے تھے کہ "لا أسألكم عليه مالاً" (میں (اس دعوت کے بدلہ) تم سے مال کا طلبگار نہیں ہوں) "لا أسألكم عليه أجراً" (میں (اس دعوت کے بدلہ) تم سے کوئی دنیاوی چیز کا طالب نہیں ہوں) سب سے پہلے رسول نوح علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں: "ويا قوم لا أسألكم عليه مالاً" (اے میری قوم کے لوگو! میں اپنی اس دعوت کے بدلہ تم سے مال کا طالب نہیں ہوں) اور خاتم الرسل ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قوم سے فرمایا: "قل لا أسألكم عليه أجراً" (آپ کہہ دیجئے کہ میں اس کے عوض تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتا ہوں) تمام رسولوں کی یہی سنت رہی ہے۔

موجودہ دور کی مصیبت یہ ہے کہ دعوت کمائی اور دنیوی منفعت کے حصول کا ذریعہ بن گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی سے مدد طلب کی جاتی ہے۔

کسی عالم نے اس صورت حال کو بہت خوبصورت عبارت میں پیش کیا ہے: پہلے دعوت تاوان ہوا کرتی تھی اب حصول مال کا ذریعہ بن گئی ہے۔

تنبیہ: یہ ضروری ہے کہ ہم دعوت الی اللہ کی دو مقامات میں فرق کریں۔ دعوت دینے کا پہلا مقام یہ ہے کہ داعی اس کے لئے کمربستہ ہو اور پوری تیاری کے ساتھ میدان دعوت میں قدم رکھے۔ اس کے لئے دین کا ضروری علم ہونا، اچھا نمونہ بننا اور دوسری شرطیں ہیں۔ دعوت کا دوسرا مقام یہ ہے کہ کوئی دین کی کوئی بات پیش کرے یا دین کا علم دوسروں سے نقل کرے۔ اس مقام پر انسان اپنے قریبی رشتہ داروں میں سے جن سے محبت کرتا ہے ان تک سنی ہوئی دین کی باتیں پہنچاتا ہے۔ یہ دوسرا مقام پہلے سے فروتر اور ہلکا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "میری طرف سے پہنچاؤ اگرچہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔" (صحیح بخاری) کا یہی مطلب ہے۔ دعوت کے ان دونوں مقامات میں فرق کرنا ضروری ہے۔ آج کی صورت حال میں دونوں کو خلط ملط کر دیا گیا ہے جس کے نتیجہ میں واضح طور پر گڑبڑی دیکھنے کو مل رہی ہے۔

دعوت، اس کی فضیلت، وسائل اور شروط کے بارے میں اگر گفتگو کی جائے تو بات لمبی ہو جائے گی۔ اس موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔ تفصیل کے لئے ان کتابوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔

مصنف کا قول [چوتھا مسئلہ: دعوت کی راہ میں اذیتوں پر صبر کرنا ہے]

اللہ تعالیٰ نے اپنے جاری کردہ فطری نظام کے تحت یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جو شخص بھی لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلانے اور نصیحت کرنے کے لئے اٹھے گا تو وہ لازمی طور پر کچھ لوگوں کی طرف سے یا اکثریت کی طرف سے اذیت و تکلیف کا سامنا کرے گا، اسی لئے اللہ نے اپنے ولیوں کو اس اذیت پر صبر کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کے بدلہ ان سے بڑے اجر و ثواب کا وعدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "يا حسرة على العباد ما يأتيهم من رسول إلا كانوا به يستهزئون" ((ایسے) بندوں پر افسوس! کبھی بھی کوئی رسول ان کے پاس نہیں آیا جس کی ہنسی انہوں نے نہ اڑائی ہو) دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كذلك ما أتى الذين من قبلهم من رسول إلا قالوا ساحر أو مجنون أتواصوا به" (اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں ان کے پاس جو بھی رسول آیا انہوں نے کہہ دیا کہ یا تو یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے، کیا یہ اس بات کی ایک دوسرے کو وصیت کرتے گئے ہیں)

جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نیکی کا حکم کرنے اور برائی سے روکنے کی وصیت کی تھی تو اس کے ساتھ ہی صبر کرنے کی بھی وصیت کی تھی۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وامر بالمعروف وانه عن المنكر واصبر على أصابك" (اچھے کام کی نصیحت کرتے رہنا، برے کاموں سے منع کیا کرنا اور جو مصیبت تم پر آجائے صبر کرنا) اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں یہ بات واضح

کر دی ہے کہ جو شخص دعوت إلی اللہ کے لئے اٹھے گا اسے لوگوں کی مخالفت اور اذیت کا سامنا بھی کرنا پڑے گا اور اس صورت حال میں اسے صبر کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنا پڑے گا۔

جب اللہ تعالیٰ نے دعوت کی فضیلت یہ کہہ کر بیان کر دی "ومن أحسن قولا ممن دعا إلى الله" (اور اس سے اچھی بات والا کون ہے جو اللہ کی طرف بلائے) تو اس کے بعد یہ بھی ارشاد فرمایا: "ادفع بالتي هي أحسن السيئة" (برائی کو بھلائی سے دفع کرو)

عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے واقعہ میں مذکور ہے کہ جب خدیجہ رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: جب بھی کسی نے وہ دعوت پیش کی جو آپ پیش کرنے والے ہیں تو اس کی قوم دشمنی پر اتر آئی۔ (متفق علیہ)

ہمارے شیخ ابن عثیمین نے اس آیت کے ضمن میں ایک بہت دلچسپ فائدہ بیان کیا ہے "إنا نحن نزلنا عليك القرآن تنزيلا" (بیشک ہم نے تجھ پر بتدریج قرآن نازل کیا) آیت کے اس ٹکڑے کے بعد توقع تھی کہ آگے کہا جائے گا کہ "فاشكر نعمة ربك عليك" یعنی لہذا آپ اپنے رب کی نعمتوں کا شکر ادا کیجئے لیکن اللہ عزوجل نے اس کے بجائے یہ ارشاد فرمایا: "فاصبر لحكم ربك" (پس تو اپنے رب کے حکم پر قائم رہ) اس میں یہ اشارہ ہے کہ جو بھی اس قرآن کے پیغام کو لے کر کھڑا ہو گا یقینی طور پر اسے لوگوں کی طرف سے تکلیف اور اذیت کا سامنا ہو گا جس کے لئے اسے صبر کرنے کی ضرورت ہو گی۔

ان ساری باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص لوگوں کی دینی خیر خواہی کا فریضہ انجام دینے کے لئے کمربستہ ہو اسے چاہئے کہ انبیاء کی اقتداء کرتے ہوئے خود کو صبر کی صفت سے آراستہ کرے، لوگوں کی اذیتوں کو برداشت کرے، برے سلوک کا بدلہ اچھے سلوک سے دے اور ان ساری تکالیف اور پریشانیوں میں اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کا طالب ہو۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ والعصر إن الإنسان لفي خسر إلّا الذين آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر] (ترجمہ: شروع کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ زمانے کی قسم، بیشک انسان سر تا سر نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور (جنہوں نے) آپس میں حق کی وصیت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی)

یہ سورہ چاروں مسائل کے وجوب کی دلیل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس نے ان چاروں مسائل کی تکمیل نہیں کی وہ خسارہ میں ہے۔

سعدی فقہی قواعد سے متعلق اپنی نظم کی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں: اس سورہ میں جن باتوں کی تلقین کی گئی ہے اگر ان میں سے ایک بھی کام کسی سے فوت ہو جائے تو فوت شدہ کے بقدر اسے خسارہ حاصل ہو گا۔

سعدی نے اپنی تفسیر میں کہا ہے: خسارہ کے بھی الگ الگ متعدد درجات ہیں۔

اس سورہ میں عصر سے کیا مراد ہے؟ اس تعلق سے اہل علم کے بہت سے مختلف اقوال ہیں۔ ان اقوال میں سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ عصر سے مراد عصر کا معروف وقت ہے واللہ اعلم۔ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات کے مختلف حصوں کی قسم کھائی ہے۔ اس نے وقت فجر، چاشت، عصر اور رات کی قسم کھائی ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی مخلوقات میں سے جس کی چاہتا ہے قسم کھاتا ہے لیکن مخلوق کے لئے اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانا جائز نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد: (الذین آمنوا) علم کی دلیل ہے۔ یہ دلالت لازم کے اعتبار سے ہے، اس لئے کہ علم کے بغیر ایمان کا وجود ممکن نہیں ہے۔ یہ شیخ رحمہ اللہ کا بیان کردہ علمی نکتہ ہے۔

سعدی کہتے ہیں: علم کے بغیر ایمان کا وجود نہیں ہو گا، ایمان علم کی شاخ ہے، اس کی تکمیل علم کے بغیر نہیں ہو سکتی ہے۔

(عملوا الصالحات) عمل کی دلیل ہے۔ (تواصوا بالحق) دعوت کی دلیل ہے۔ (تواصوا بالصبر) صبر کی دلیل ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: نفس کے جہاد کے چار درجات ہیں:

1۔ ہدایت اور دین حق کو سیکھنے کے لئے نفس سے جہاد کرے گا۔

2۔ علم کے بعد عمل کرنے کے لئے نفس سے جہاد کرے گا، اس لئے کہ عمل کے بغیر صرف علم اگر نقصاندہ نہ ہو تو نفع بخش بھی نہیں ہو گا۔

3۔ اس علم کی طرف دعوت دینے اور دوسروں کو اسے سکھانے کے لئے نفس سے جہاد کرے گا۔

4۔ دعوت الی اللہ کی راہ کی مشقتوں اور مخلوق کی اذیتوں پر صبر کرنے کے لئے نفس سے جہاد کرے گا اور اللہ کی خاطر ان تکالیف کو برداشت کرے گا۔ جب وہ ان چاروں درجات کی تکمیل کر لیتا ہے تو وہ رب تعالیٰ سے وابستہ لوگوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ سلف کا اس پر اتفاق ہے کہ کوئی عالم دین اسی وقت عالم ربانی کہلانے کا مستحق ہو گا جب وہ حق کو جان لے، اس پر عمل کرے، اسے دوسروں تک پہنچائے۔ جس نے جانا، عمل کیا اور تعلیم دی وہی عالم بالا میں عظیم کہلاتا ہے۔ تصرف اور اختصار کے ساتھ ابن قیم رحمہ اللہ کے کلام کو نقل کیا گیا۔

ابن قیم رحمہ اللہ نے الرسالۃ التبوکیۃ میں کہا ہے: کمال انسانی کا انحصار ان ہی چاروں درجات پر ہے:

1۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ لے کر آئے ہیں اس کا علم حاصل کرے۔

2۔ اس علم پر عمل کرے۔

3۔ اس علم کی لوگوں میں اشاعت کرے اور انہیں اس کی دعوت دے۔

4۔ اس فریضہ کی ادائیگی میں صبر و مجاہدہ سے کام لے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے لئے اس سورہ کے علاوہ کوئی اور حجت نازل نہ کی ہوتی تب بھی کافی ہوتی]

دوسرے الفاظ میں (اگر لوگ اس سورہ پر غور کریں تو ان کے لئے کافی ہو جائے گی۔) اس قول کو دیگر الفاظ کے ساتھ بھی نقل کیا گیا ہے لیکن سب کا معنی و مفہوم ایک ہی ہے۔

ابن تیمیہ شافعی کے کلام کے بارے میں کہتے ہیں: انہوں نے جو بات کہی ہے وہ بالکل صحیح ہے۔

شافعی رحمہ اللہ کی مراد یہ ہے کہ اس سورہ نے کامیابی کے راستہ کو بھی واضح کر دیا ہے اور خسارہ کے راستہ کو بھی واضح کر دیا ہے۔

یہ اس سورہ کی عظمت کی دلیل ہے۔ نیز یہ سلف صالح کے عظیم تفقہ اور ان کے وسعت علم کی بھی دلیل ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ "اِغاثۃ اللھفان" میں رقمطراز ہیں: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے زمانہ کی قسم کھائی ہے جس میں نفع بخش اور نقصاندہ دونوں طرح کے اعمال انجام دیئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات پر قسم کھائی ہے کہ ہر شخص خسارہ میں ہے سوائے اس کے جس نے اپنی علمی قوت کو ایمان باللہ کے ذریعہ مکمل کر لیا، اپنی عملی قوت کو اللہ کی اطاعت کے ذریعہ مکمل کر لیا، یہ دونوں طرح کا کمال اس کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اس نے دوسروں کو حق کی وصیت کرکے اور بھلائی کا حکم دے کر اور اس کے اصل سرمایہ یعنی صبر کی تلقین کرکے مکمل کر دیا۔

اس طرح اس نے اپنی ذات کو علم نافع اور عمل صالح کے ذریعہ مکمل کر دیا اور دوسرے کو علم سکھا کر اور صبر کی تلقین کرکے مکمل کر دیا۔ اسی لئے شافعی رحمہ اللہ نے یہ بات کہی ہے کہ اگر لوگ سورہ (والعصر) میں غور و فکر کریں تو یہ ان کے لئے کافی ہو جائے گی۔

قرآن مجید میں اس طرح کے مضامین بہت سی جگہوں پر مذکور ہوئے ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ خبر دیتا ہے کہ اہل سعادت وخوش نصیب وہ ہیں جنہوں نے حق کو جانا اور اس کی اتباع کی اور بدبخت لوگ وہ ہیں جو حق سے ناواقف رہے اور گمراہ ہو گئے یا وہ جنہوں نے حق کو جانا لیکن اس کی مخالفت کی اور باطل کی اتباع کی۔

ابن قیم رحمہ اللہ "مفتاح دار السعادۃ" میں لکھتے ہیں: مختصر ہونے کے باوجود یہ سورت (والعصر) ہر طرح کے خیر کو سمیٹنے والی قرآن کی جامع سورتوں میں سے ایک ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [بخاری رحمہ اللہ کا قول ہے: باب: قول و عمل سے پہلے علم ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "فاعلم أنه لا إله إلا الله واستغفر لذنبك" اس میں اللہ تعالیٰ نے قول و عمل سے پہلے علم کا تذکرہ کیا ہے] بخاری رحمہ اللہ نے جو باب قائم کیا ہے وہ ان کے عظیم الشان فقاہت اور استنباط کی قوت کی دلیل ہے۔[1]

---

[1] مصنف رحمہ اللہ نے امام بخاری کے کلام کو معناً نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری میں پوری عبارت اس طرح ہے: باب العلم قبل القول والعمل لقول اللہ تعالیٰ (فاعلم أنہ لا إلہ إلّا اللہ) یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے علم کو ذکر کیا ہے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اللہ تعالیٰ کے ارشاد: "فاعلم أنّه لا إله إلّا الله واستغفر لذنبك" میں اس بات کی دلیل ہے کہ سب سے پہلے جس بات کو جاننا اور سیکھنا واجب ہے وہ توحید ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے کلام کو یہاں ذکر کرنے کی مناسبت یہ ہے کہ اس آیت میں علم کے وجوب کی صراحت کی گئی ہے، اس لئے کہ اس میں امر کا صیغہ استعمال ہوا ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے اور سورۃ والعصر کی آیت میں علم کا لزوم اور وجوب سیاق وسباق سے سمجھا گیا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مصنف رحمہ اللہ نے ان چاروں مسائل کی ترتیب کو واضح کرنے کے لئے امام بخاری کا کلام ذکر کیا ہو جس میں یہ وضاحت ہے کہ علم سب سے پہلے ہے اس کے بعد عمل ہے۔ واللہ اعلم

= یہ پوری عبارت فتح الباری (1/192) مکتبہ ابن تیمیہ کی طباعت میں موجود ہے۔ اس میں (واستغفر لذنبك) کا اضافہ نہیں ہے (یہ اضافہ کچھ دوسرے نسخے میں موجود ہے)۔ نیز دوسری جگہ (قبل القول والعمل) کا اضافہ بھی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے، آپ یہ بات جان لیں کہ ہر مسلمان مرد و عورت کے لئے مندرجہ ذیل تین مسائل کو جاننا اور ان پر عمل کرنا واجب ہے:

پہلا مسئلہ: اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا ہے اور اسی نے ہمیں رزق عطا کیا ہے۔ اس نے ہمیں پیدا کر کے بیکار نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ اس نے ہماری رہنمائی کے لئے رسول کو مبعوث کیا، جس نے اس کی اطاعت کی وہ جنت کا مستحق ہو گا اور جس نے اس کی نافرمانی کی وہ جہنم میں ڈالا جائے گا۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "إنا أرسلنا إليكم رسولاً شاهدا عليكم كما أرسلنا إلى فرعون رسولا فعصى فرعون الرسول فأخذناه أخذا وبيلا" (بیشک ہم نے تمہاری طرف بھی تم پر گواہی دینے والا رسول بھیج دیا ہے جیسے کہ ہم نے فرعون کے پاس رسول بھیجا تھا تو فرعون نے اس رسول کی نافرمانی کی تو ہم نے اسے سخت (وبال کی) پکڑ میں پکڑ لیا)

دوسرا مسئلہ: اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ عبادت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، نہ مقرب فرشتہ کو اور نہ نبی مرسل کو۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وأن المساجد لله فلا تدعوا مع الله أحدا" (اور یہ کہ مسجدیں صرف اللہ ہی کے لئے خاص ہیں پس اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو)

تیسرا مسئلہ: جس نے رسول کی اطاعت کی اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کر لیا اس کے لئے جائز نہیں ہے کہ ان لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھنے والے ہیں، اگرچہ وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "لا تجد قوما يؤمنون بالله واليوم الآخر يوادّون ما حادّ الله ورسوله ولو كانوا آباءهم أو أبناءهم أو إخوانهم أو عشيرتهم أولئك كتب في قلوبهم الإيمان وأيدهم بروح منه ويدخلهم جنات تجري من تحتها الأنهار خالدين فيها رضي الله عنهم ورضوا عنه أولئك حزب الله ألا إن حزب الله هم المفلحون"

(اللہ تعالیٰ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھنے والوں کو آپ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے محبت رکھتے ہوئے ہر گز نہ پائیں گے گو وہ ان کے باپ یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے کنبہ (قبیلے) کے عزیز ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے ایمان کو لکھ دیا ہے اور جن کی تائید اپنی روح سے کی ہے اور جنہیں ان جنتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں جہاں یہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ ان سے راضی ہے اور یہ اللہ سے خوش ہیں یہ خدائی لشکر ہے، آگاہ رہو بیشک اللہ کے گروہ والے ہی کامیاب لوگ ہیں)

یہ دوسرا رسالہ ہے۔

اس کا خلاصہ: ان تینوں مسائل کو جاننا اور ان پر عمل کرنا واجب ہے۔ وہ تینوں مسائل یہ ہیں:

1۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا واجب ہونا۔

2۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا واجب ہونا۔

3۔ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے دشمنی کا واجب ہونا۔

کچھ شارحین نے لکھا ہے کہ پہلے مسئلہ کے تحت توحید ربوبیت کے بارے میں بات کی گئی ہے، دوسرا مسئلہ توحید الوہیت سے متعلق ہے اور تیسرا مسئلہ دوستی اور لاتعلقی سے متعلق ہے۔ لیکن بظاہر ایسی بات نہیں ہے، اس لئے کہ مصنف رحمہ اللہ نے ہر مسئلہ کے تحت جو دلائل ذکر کئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ پہلا مسئلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے وجوب کے بارے میں ہے، دوسرا مسئلہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے وجوب کے بارے میں ہے اور تیسرا مسئلہ مشرکین سے اظہار براءت کے بارے میں ہے۔

کچھ شارحین نے لکھا ہے کہ اس پورے مقدمہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں اصلاً دوستی اور لاتعلقی کے بارے میں کلام کیا گیا ہے اور پہلا و دوسرا مسئلہ تیسرے مسئلہ کی تمہید ہے۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے، اللہ کی وحدانیت کا اقرار کرنے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت قبول کرنے کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے دشمنی نبھائیں جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالف ہیں، اس لئے کہ ایک ہی دل میں توحید اور اس کی ضد اور مکمل اطاعت اور اس کے برخلاف چیز جمع نہیں ہو سکتی ہے۔

ایک اعتبار سے ایسا کہنا صحیح ہے لیکن زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ اس مبحث میں ہر مسئلہ بذات خود مراد ہے جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے اوپر کہا ہے کہ (ان تینوں مسائل کو جاننا ہر مسلمان کے لئے واجب ہے)

یہی رسالہ "مجموعۃ التوحید" میں صفحہ 12 پر دوسرے الفاظ کے ساتھ منقول ہے، وہاں تیسرے مسئلہ کے تحت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے واجب ہونے کا ذکر نہیں ہے۔ واللہ اعلم

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اللہ تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا ہے.....]

یہ پہلا مسئلہ ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت واجب ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اللہ نے ہمیں پیدا کیا ہے] اس کی دلیل میں بہت سی آیات وارد ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے: "واللہ خلقکم وما تعملون" (حالانکہ تمہیں اور تمہاری بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اللہ ہی نے ہمیں رزق دیا ہے] اس کی دلیل میں بھی بہت سی آیات وارد ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے: "إن الله هو الرزاق ذو القوة المتين" (اللہ تعالیٰ تو خود ہی سب کا روزی رساں توانائی والا اور زور آور ہے)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اور ہمیں بے کار نہیں چھوڑا ہے] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "أفحسبتم أنما خلقناكم عبثا" (کیا تم یہ گماں کئے ہوئے ہو کہ ہم نے تمہیں یونہی بیکار پیدا کیا ہے) دوسری جگہ ارشاد ہے: "أيحسب الإنسان أن يترك سدى" (کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے بیکار چھوڑ دیا جائے گا)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [بلکہ اللہ نے ہماری رہنمائی کے لئے رسول بھیجا] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إنا أرسلنا إليكم رسولا شاهدا عليكم" (بیشک ہم نے تمہاری طرف بھی تم پر گواہی دینے والا رسول بھیج دیا ہے)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [جس نے رسول کی اطاعت کی وہ جنت میں جائے گا] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن يطع الله ورسوله يدخله جنات تجري من تحتها الأنهار" (جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے اسے اللہ ایسی جنتوں میں داخل کرے گا جس کے (درختوں) تلے نہریں جاری ہیں)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [جو اس کی نافرمانی کرے گا وہ جہنم میں جائے گا] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن يعص الله ورسوله ويتعدّ حدوده يدخله نارا خالدا فيها وله عذاب مهين" (اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نافرمانی کرے اور اس کی مقررہ حدوں سے آگے نکلے اسے وہ جہنم میں ڈال دے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا، ایسوں ہی کے لئے رسوا کن عذاب ہے) اس کے بعد مصنف رحمہ اللہ نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے واجب ہونے کی دلیل ذکر کی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ اس کی عبادت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے، چاہے وہ کوئی مقرب فرشتہ ہو یا نبی مرسل۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وأن المساجد لله فلا تدعوا مع الله أحدا"[1]]

---

1 مساجد سے اعضائے سجود یا سجدے کی جگہیں یا بذات خود سجدے مراد ہیں۔ اس سلسلہ میں کئی اقوال ہیں۔

یہ دوسرا مسئلہ ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو ماننا واجب ہے۔ قرآن مجید کی بہت سی آیات میں شرک کی ممانعت اور شرک واہل شرک کی مذمت وارد ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا یرضیٰ لعبادہ الکفر" (اور وہ اپنے بندوں کی ناشکری سے خوش نہیں ہوتا)

صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کہتا ہے: میں شرک کرنے والوں کے شرک سے بے نیاز ہوں۔ جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کیا تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔

مصنف رحمہ اللہ نے یہاں مقرب فرشتہ اور نبی مرسل کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کی صراحت اس لئے کی ہے کہ ان دونوں کے علاوہ کسی اور چیز کو بدرجۂ اولی اللہ کا شریک نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اور اللہ کی وحدانیت کا اقرار کیا اس کے لئے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرنے والوں سے دوستی رکھنا جائز نہیں ہے، چاہے وہ سب سے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "لا تجد قوما ..... الخ"]

یہ تیسرا مسئلہ ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار سے دشمنی رکھنا واجب ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھ جو انبیاء[1] اس راستہ پر تھے ان کے بارے میں کہا ہے: "قد كانت لكم أسوة حسنة في ابراهيم والذين معه إذ قالوا لقومهم إنا براء منكم ومما تعبدون من دون الله كفرنا بكم وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء أبدا حتى تؤمنوا بالله وحده" ((مسلمانو!) تمہارے لئے حضرت ابراہیم میں اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے برملا کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سب سے بالکل بیزار ہیں۔ ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں، جب تک تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کے لئے بغض وعداوت ظاہر ہوگئی)

---

1. ایک قول یہ ہے کہ ان کے ساتھ جو مومنین تھے وہ مراد ہیں اور دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے ان کے ساتھ اس راہ پر چلنے والے انبیاء مراد ہیں۔ یہی قول زیادہ صحیح ہے۔

یہ مسئلہ دین کے اہم مسائل میں سے ایک ہے۔ یہ ایمان اور اللہ و رسول کی سچی محبت کی دلیل ہے۔ شرک اور اہل شرک سے اظہار براءت کے بغیر سچے ایمان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ایمان کی سب سے مضبوط کڑی یہ ہے کہ تم اللہ کے لئے محبت کرو اور اللہ ہی کے لئے بغض رکھو۔ یہ مسند احمد کی روایت ہے، شیخ البانی نے اسے حسن کہا ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ آیت کریمہ (لا تجد قوما..... الخ) کے بارے میں کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ تم ایسا کوئی مومن نہیں پاؤگے جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالفین سے دوستی رکھتا ہو۔ ایمان اور کفار و مشرکین سے دوستی ایک دوسرے کے منافی ہے جس طرح دو متضاد چیزیں ایک دوسرے کے منافی ہوتی ہیں۔ جہاں ایمان ہوگا وہاں اس کی ضد یعنی اللہ کے دشمنوں سے دوستی نہیں ہوگی۔ اگر کوئی شخص اللہ کے دشمنوں سے دلی دوستی رکھتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا دل واجبی ایمان سے خالی ہے۔

موالات کی اصل: موالات ولایۃ سے ہے جس کے معنی محبت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "هنالك الولاية لله" اس آیت میں ولایۃ سے مراد اللہ کی محبت و مودت اور نصرت ہے۔ اس مسئلہ اور اس کی فروع کے بارے میں نواقض الاسلام کی شرح میں کلام کریں گے ان شاء اللہ، لیکن یہاں پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ کفار سے دوستی کی دو قسمیں ہیں:

1۔ وہ دوستی جو مومن کو ملت اسلام سے خارج کر دیتی ہے۔ یہ موالات کبریٰ ہے۔ اس کی چند شکلیں یہ ہیں:

کفار کے دین سے محبت کرنا یا کافر سے اس کے دین کی وجہ سے محبت کرنا یا کفار کے دین کو صحیح قرار دینا یا اس بات سے محبت کہ ہمیشہ مسلمانوں پر کفار کو فتح حاصل ہوتا کہ کفر کا ظہور ہو۔

2۔ وہ دوستی جو مومن کو ملت اسلام سے خارج نہیں کرتی ہے لیکن یہ بھی بہت بڑا جرم ہے۔ اس زمرہ میں کفار کی وہ دوستی آتی ہے جو موالات کبری کا وسیلہ بنے۔

اس کی بہت سی قسمیں ہیں مثلاً مجلسوں میں کفار کو آگے رکھنا، کفار کو مسلمانوں کا سرپرست بنانا، کفار سے مشابہت اختیار کرنا اور ان کا اکرام کرنا۔

یہاں یہ تنبیہ ضروری ہے کہ کفار کے ساتھ بھلائی اور انصاف کا معاملہ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی اور تمہیں جلا وطن نہیں کیا ان کے ساتھ سلوک و احسان کرنے اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں نہیں روکتا بلکہ اللہ تعالیٰ تو انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

اسی طرح ان سے خرید و فروخت کا معاملہ کرنے، مصلحت کی خاطر ان سے ملاقات کرنے اور انہیں تحفہ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ ان سب کی دلیلیں سنت میں موجود ہیں۔ صرف قلبی محبت کی ممانعت ہے اور ہر وہ بات اور عمل جو قلبی محبت کا ذریعہ بنے اس کی ممانعت ہے۔

سعدی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں: جب سورہ الممتحنۃ کی وہ آیات کریمہ نازل ہوئیں جن میں کافروں سے دشمنی کا تعلق رکھنے کو کہا گیا ہے تو ان کا مومنوں کے اوپر بہت گہرا اثر ہوا، اس حکم کو انہوں نے بہت سنجیدگی سے لیا اور اپنے کچھ مشرک رشتہ داروں سے تعلقات کو گناہ شمار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ممانعت میں شامل ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں خبر دی کہ اس طرح کا عام تعلق حرام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين) یعنی اللہ تعالیٰ مشرک رشتہ داروں کے ساتھ نیکی و بھلائی کرنے، بھلائی کا بدلہ بھلائی سے دینے اور ان کے ساتھ انصاف کرنے سے منع نہیں کرتا ہے جبکہ دین کے معاملہ میں ان لوگوں نے تم سے قتال نہ کیا ہو اور نہ تمہیں جلا وطن کیا ہو۔ ایسے لوگوں سے تعلق رکھنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، کیونکہ اس طرح کا تعلق ممانعت کے زمرہ میں نہیں آتا ہے اور نہ اس سے کوئی خرابی پیدا ہونے کا امکان ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے مشرک والدین کے بارے میں کہا ہے کہ جب ان کی اولاد مسلمان ہو اور والدین اسے شرک کرنے کے لئے دباؤ ڈالیں تو ان کی بات نہ مانو لیکن دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو "وإن جاهداك على أن تشرك بي ما ليس لك به علم فلا تطعهما وصاحبهما في الدنيا معروفا" (اگر وہ دونوں تجھ پر اس بات کا دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شریک کرے جس کا تجھے علم نہ ہو تو تو ان کا کہنا نہ ماننا، ہاں دنیا میں ان کے ساتھ اچھی طرح بسر کرنا)

(إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم في الدين) یعنی جس نے دین کی وجہ سے تم سے لڑائی لڑی، اللہ کے دین اور اس پر عمل کرنے والوں کی عداوت میں (وأخرجوكم من دياركم وظاهروا) یعنی دوسروں کی مدد کی (على إخراجكم) تمہیں جلا وطن کرنے کے لئے تو اللہ تم کو منع کرتا ہے (أن تولوهم) کہ تم محبت اور تعاون یا قول و عمل کے ذریعہ ان کو اپنا سرپرست بناؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے

ساتھ نیکی و بھلائی کا سلوک کرنے سے نہیں روکا ہے، اس لئے کہ یہ انہیں سرپرست بنا لینے جیسا کام نہیں ہے بلکہ یہ رشتہ دار اور عام لوگوں کے ساتھ احسان کرنے کے عمومی حکم میں داخل ہے۔

(ومن يتولهم فأولئك هم الظالمون) جس درجہ کی سرپرستی قبول کی ہے اس کے اعتبار سے یہ ظلم ہو گا۔ اگر مکمل سرپرستی قبول کی ہے تو یہ ایسا کفر ہو گا جو مومن کو دائرہ اسلام سے باہر کر دیتا ہے۔ اس کے نیچے سرپرستی کے کئی درجے ہیں جن میں سے کچھ سخت ہیں اور کچھ کمتر ہیں۔ شیخ سعدی کی بات ختم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت کی طرف آپ کی رہنمائی کرے، آپ یہ بات جان لیں کہ حنیفیت سے مراد ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے یعنی آپ صرف اللہ کی عبادت کریں دین کو اس کے لئے خالص کرکے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو اسی کا حکم دیا ہے اور سب کو اسی کے لئے پیدا کیا ہے جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے: "وما خلقت الجن والإنس إلّا ليعبدون" (میں نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے)

اس آیت میں یعبدون سے مراد یوحدون ہے (یعنی تاکہ وہ اللہ کی وحدانیت کو تسلیم کریں)

اللہ تعالیٰ کا سب سے اہم حکم توحید ہے یعنی صرف اللہ کی عبادت کرنا۔

سب سے بڑی چیز جس سے اللہ نے منع کیا ہے شرک ہے یعنی اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارنا۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئا "(تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو)

یہ تیسرا رسالہ ہے۔

اس کا خلاصہ: توحید کی حقیقت واہمیت کو واضح کرنا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [آپ جان لیں، اللہ تعالیٰ اپنی اطاعت کی طرف آپ کی رہنمائی کرے] یہ دعائیہ جملہ ہے، اس میں نرمی، شفقت اور مہربانی کا اظہار ہے۔ "الرشد" کے معنی ہدایت کے ہیں، یہ "الغی" یعنی گمراہی و کجروی کی ضد ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [حنیفیت[1] سے مراد ملت ابراہیم (علیہ السلام) ہے: یعنی یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں دین کو اس کے لئے خالص کر کے]

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: پورا قرآن مجید اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حنیفیت سے مراد ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے جس کا مرکزی عنوان ایک اللہ کی عبادت اور شرک سے اظہار براءت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کی جائے گی جیسا حکم دیا گیا ہے اور اس کے لئے جو طریقہ مشروع کیا گیا ہے۔ یہ حنیفیت میں داخل ہے، اس میں گڑھی ہوئی خود ساختہ عبادات داخل نہیں ہیں۔

اور حنیف[2] وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور غیر اللہ سے اعراض کرنے والا ہو۔ مصنف رحمہ اللہ نے یہاں اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے: آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں دین کو اس کے لئے خالص کر کے۔ یہی وہ توحید ہے جسے سارے رسول لے کر آئے تھے۔

---

1. حدیث (بعثت بالحنیفیۃ السمحۃ) کی سند میں کلام ہے۔ ابن رجب نے اسے ضعیف کہا ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: حنیفیت شرک کی ضد ہے اور سماحۃ تنگی و رکاوٹ کی ضد ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ایسی ملت کے ساتھ ہوئی تھی جو توحید میں حنیفیت کی راہ پر تھی اور عمل میں کشادگی کی حامل تھی۔
2. حنیف حَنَفَ سے مشتق ہے۔ بہت سے اہل لغت نے حنف کا معنی میلان کیا ہے اور حنیف کا معنی خیر کی طرف مائل ہونے والا کئے ہیں۔ کچھ اہل لغت نے یہ کہا ہے کہ حنف کے معنی ہیں خیر کی طرف میلان اور جنف کے معنی ہیں شر کی طرف میلان۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے اس مسئلہ پر ایک خاص بحث کے تحت روشنی ڈالی ہے، بہتر ہے کہ اس کی طرف رجوع کیا جائے۔ انہوں نے کہا ہے کہ حنیف کے معنی متوجہ ہونے والے کے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ حنیف کی تشریح میں سلف کے کئی اقوال ہیں: محمد بن کعب قرظی کے بقول یہ مستقیم کے معنی میں ہے، مجاہد کے بقول اس کے معنی متبع کے ہیں، عطاء کے بقول یہ مخلص کے معنی میں ہے۔ کچھ متاخرین اہل لغت نے اس کے معنی مائل بتائے ہیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ اپنی کتاب جلاء الأفہام میں کہتے ہیں: حنیف کا مطلب ہے اللہ کی طرف متوجہ ہونے والا اور غیر اللہ سے اعراض کرنے والا۔ جنہوں نے اس کی تشریح مائل سے کی ہے انہوں نے اس کے لفظی معنی کا اعتبار نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے اس کے لازمی معنی کے ذریعہ اس کی تشریح کی ہے، اس لئے کہ حنف کے معنی ہیں متوجہ ہونا، اور جو کسی چیز کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ دوسری چیز کی طرف سے مائل ہو جاتا ہے۔ دونوں پاؤں میں حنف کا مطلب ہوتا ہے ایک پاؤں کا دوسرے پاؤں کی طرف مڑنا اور اس سے یہ لازم آتا ہے کہ وہ پاؤں اپنی سمت سے دوسری طرف مڑ گیا۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: دین حنیف کا مطلب ہے ایک اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور غیر اللہ سے اعراض کرنا۔ یہی وہ اخلاص ہے جس کی ترجمانی کلمۂ حق اور کلمۂ طیبہ (لا إله إلا الله) کے ذریعہ کی گئی ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی بات ختم ہوئی۔

ابراہیم علیہ السلام کی ملت جس کی اتباع کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر دیا ہے "ثم أوحينا إليك أن اتبع ملة إبراهيم حنيفا" (پھر ہم نے آپ کو وحی کی کہ یکسو ہو کر ابراہیم (علیہ السلام) کی ملت کی اتباع کریں) یہی تمام رسولوں کی ملت ہے۔ یہ ملت توحید ہے۔

عرب زمانۂ جاہلیت میں ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی طرف اپنا انتساب کرتے تھے اور اس معاملہ میں صابئین اور اہل کتاب کے برخلاف راہ اپنائے ہوئے تھے۔ یہ عرب ان لوگوں کے برخلاف بیت اللہ کا حج کرتے تھے اور ختنہ کرواتے تھے۔

ابو عبید کے بقول: عربوں کے نزدیک حنیف کا مطلب ہے وہ شخص جو ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہو۔

جمہرۃ اللغۃ میں آیا ہے، ابو حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اصمعی سے کہا: زمانۂ جاہلیت میں حنیف کی کیا تعریف کی گئی؟ انہوں نے جواب دیا: ہر وہ شخص جو نصاری کے دین سے الگ تھلگ رہا وہ ان کے نزدیک حنیف کہلایا۔ اصمعی کی بات ختم ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں حنیف کہلانے والے یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے ہر اعتبار سے مخالف تھے جیسا کہ ان کی صورت حال سے ظاہر ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کو اسی کا حکم دیا ہے اور اسی کے لئے ان کی تخلیق کی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون" اس آیت میں لیعبدون کے معنی یوحدون کے ہیں (یعنی تاکہ وہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار کریں)]

= ابن قیم رحمہ اللہ نے مفتاح دار السعادۃ میں کہا ہے: حنیف کا مطلب ہے اللہ کی طرف متوجہ ہونے والا اور اس کا لازمی مفہوم یہی ہے کہ اس نے غیر اللہ کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ یعنی حنیف کے لازمی معنی میلان کے ہیں، نہ کہ لغوی معنی۔

اللہ تعالیٰ نے بندوں کو اپنی عبادت کرنے کا حکم دیا ہے اس کا ذکر قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں آیا ہے۔ قرآن مجید میں ترتیب مصحف کے اعتبار سے سب سے پہلی مرتبہ یہ حکم ان الفاظ میں آیا ہے: "يا أيها الناس اعبدوا ربكم "(اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو)

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی تخلیق اپنی عبادت کے لئے کی ہے اس کا بیان اس آیت میں موجود ہے "وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون "(میں نے جنات اور انسانوں کی تخلیق صرف اپنی عبادت کرنے کے لئے کی ہے)

یعبدون کی تفسیر (یوحدون) سے کی گئی ہے، یہ کسی چیز کی تفسیر اس کے سب سے خاص فرد یا سب سے اہم اور بڑے فرد کے ذریعہ کرنے کی مثال ہے۔

شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کہتے ہیں: عبادت سے مراد توحید ہے، اس لئے کہ انبیاء اور ان کی قوموں کے درمیان اسی کی وجہ سے جھگڑے ہوئے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے: میں نے ان کی تخلیق اس لئے کی ہے تاکہ چاہتے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ میری بندگی کا اقرار کریں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اللہ تعالیٰ نے سب سے اہم بات جس کا حکم دیا ہے توحید ہے یعنی صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا اور سب سے اہم بات جس سے منع کیا ہے شرک ہے یعنی اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو پکارنا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "واعبدوا الله ولا تشركوا به شيئًا "(تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو)]

اللہ تعالیٰ نے بہت سے کاموں کا حکم دیا ہے اور بہت سے کاموں سے منع بھی کیا ہے۔ سب سے اہم بات جس کا اللہ نے حکم دیا ہے توحید ہے، اس لئے کہ اس سے زیادہ اہم کوئی دوسری چیز نہیں ہے اور نہ اس سے زیادہ اجر و ثواب کی حامل کوئی اور چیز ہے۔ دنیا اور آخرت کی نعمتیں صرف اسی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ توحید کی ضد شرک باللہ ہے۔ اسی لئے اس دعوت توحید پر تمام رسولوں کا اتفاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وما أرسلنا من قبلك من رسول إلّا نوحي إليه أنه لا إله إلا أنا فاعبدون "(میں نے آپ سے پہلے جن رسولوں کو بھیجا سب کو یہ وحی کی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، لہذا سب میری عبادت کرو)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: دل کے لئے توحید اور دین کو اللہ کے لئے خالص کرنے سے زیادہ نفع بخش کوئی چیز نہیں ہے اور دل کے لئے شرک سے بڑھ کر مضرت رساں کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

وہ مزید کہتے ہیں: جو شخص احوال عالم کے بارے میں غور و فکر کرے گا اسے معلوم ہو گا کہ روئے زمین پر ہر قسم کے صلاح و فلاح کا سبب اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی عبادت اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے اور دنیا میں ہر شر، فتنہ، مصیبت، قحط سالی، دشمن کے تسلط اور دوسری آزمائشوں کا سبب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور غیر اللہ کی طرف دعوت دینا ہے۔ جو اس پہلو پر صحیح طریقہ سے غور و فکر کرے گا اسے دنیا کی حالت ہو بہو ایسی ہی نظر آئے گی۔ وہ اس تناظر میں چاہے اپنے آپ کو دیکھے یا دوسرے کو عمومی و خصوصی ہر حالت میں یہی صورت حال نظر آئے گی۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: دنیا کی سختیوں کو دور کرنے کے لئے توحید سے زیادہ کارگر کوئی ذریعہ نہیں ہے، اسی لئے مصیبت کے وقت کی دعا میں توحید کا بیان ہے۔ اور ذوالنون (یونس علیہ السلام) کی دعا میں بھی اسی توحید کا ذکر ہے جس کے ذریعہ جب بھی کوئی مصیبت زدہ دعا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی مصیبت دور کر دیتا ہے۔ بڑی بڑی مصیبتوں کے گرداب میں ڈالے جانے کا سبب صرف شرک ہے اور ان مصائب سے نجات کا ذریعہ صرف توحید ہے۔ یہ توحید انسانوں کے لئے لپکنے کی جگہ، جائے پناہ، محفوظ رہنے کی جگہ اور اللہ کی مدد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

اس آیت مبارکہ میں جسے مصنف رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم بھی ہے اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے کی ممانعت بھی ہے۔ یہی توحید ہے۔

اگر آپ سے پوچھا جائے کہ وہ تین اصول کیا ہیں جنہیں جاننا ہر انسان کے لئے واجب ہے؟

تو آپ کہیں: بندہ کا اپنے رب کو، اپنے دین کو اور اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو جاننا واجب ہے۔

یہ اس رسالہ کا دوسرا حصہ ہے۔ اس میں تینوں اصولوں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہ اس رسالہ کا اصل حصہ ہے۔

اس مذکورہ بالا متن کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں تینوں اصول کو اجمالاً ذکر کیا گیا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے یہاں سے اس رسالہ کے اصل موضوع پر گفتگو شروع کی ہے اور وہ تین اصول ہیں۔ انہوں نے یہاں پر اسے اجمالاً ذکر کیا ہے۔ عنقریب آگے چل کر وہ دلائل کے ساتھ اس کی تفصیل بیان کریں گے۔

اصول: یہ اصل کی جمع ہے، لغت میں کسی چیز کے نچلے اور بنیادی حصہ کو اصل کہتے ہیں یعنی جس پر دوسری چیز کی بنیاد رکھی جائے۔ اسی سے اصل الجدار ہے یعنی اس کی وہ بنیاد جس پر اس کی تعمیر ہوئی ہے۔ اصل الشجرۃ درخت کے اس حصہ کو کہتے ہیں جو زمین کے اندر ثابت و مستحکم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ألم تر كيف ضرب الله مثلا كلمة طيبة كشجرة طيبة أصلها ثابت وفرعها في السماء" (کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ بات کی مثال کس طرح بیان فرمائی، مثل ایک پاکیزہ درخت کے جس کی جڑ مضبوط ہے اور جس کی ٹہنیاں آسمان میں ہیں)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [بندہ کا اپنے رب کو پہچاننا] اس میں اللہ تعالیٰ کو اس کی ربوبیت، الوہیت اور اسماء و صفات کے ساتھ جاننا شامل ہے۔ یہ انسان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: لذت، فرحت، سرور، زندگی کے سب سے پاکیزہ لمحات کا احساس اور وہ راحت و آرام جس کی کیفیت بیان سے باہر ہے، یہ سب اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو جاننے پہچاننے، اس کی وحدانیت کا اقرار کرنے اور اس پر ایمان لانے میں ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: جس نے اللہ تعالیٰ کو اس کے اسماء وصفات اور افعال کے ساتھ جان اور پہچان لیا، وہ لا محالہ اللہ تعالیٰ کا محبوب نظر ہو گیا۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اور بندہ کا اپنے دین کو جاننا] اس میں دین کے تینوں درجات (اسلام، ایمان اور احسان) اور حلال و حرام جیسے شرعی احکام کو جاننا شامل ہے۔ دین کا اتنا علم حاصل کرنا سب پر واجب ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے اسلام کو صحیح کر لے اور دینی احکام پر عمل کر لے۔ اس کے بعد وہ جتنا زیادہ دین کا علم حاصل کرے گا اتنا اس کے اجر و ثواب میں اضافہ ہو گا۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچاننا] اس کے لئے اجمالی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جاننا، آپ جو دین لے کر مبعوث ہوئے تھے اسے جاننا اور اس کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔

اگر آپ سے کہا جائے: آپ کا رب کون ہے؟

تو آپ کہئے: میرا رب اللہ ہے جس نے میری پرورش کی ہے اور تمام جہاں والوں کی اپنی نعمتوں سے پرورش کی ہے۔

وہی میرا معبود ہے، اس کے سوا کوئی میرا معبود نہیں ہے۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "الحمد لله رب العالمين" (سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے) اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ عالم (جہان) ہے اور میں اس عالم (جہان) کا ایک فرد ہوں۔

مصنف رحمہ اللہ نے تینوں اصول کو اجمالاً ذکر کرنے کے بعد یہاں سے اس کی تفصیلی وضاحت شروع کر دی ہے۔ انہوں نے رب کو پہچاننے سے اپنی بات شروع کی ہے۔ جیسا کہ مصنف نے یہاں ذکر کیا ہے رب کو پہچاننے میں دو باتیں شامل ہیں:

1۔ یہ جاننا کہ وہ رب ہے (یعنی توحید ربوبیت)

2۔ یہ جاننا کہ وہی تنہا معبود ہے (یعنی توحید الوہیت)

لغوی اعتبار سے رب کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جو حفاظت اور نگہداشت کرے اور اس کا اطلاق خالق و مربی (پرورش کرنے والا) پر ہوتا ہے۔ نیز اس کا اطلاق مالک، سید (آقا) مدبر (تدبیر کرنے والا) قیم (قائم رکھنے والا) منعم (انعام سے نوازنے والا) پر ہوتا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وقل رب ارحمها كما ربياني صغيرا" (اور دعا کرتے رہنا کہ اے میرے پروردگار! ان پر ویسا ہی رحم کر جیسا انہوں نے میرے بچپن میں میری پرورش کی ہے)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: رب کا مطلب ہے مربی (پرورش کرنے والا) خالق، رازق، ناصر (مدد کرنے والا) اور ہادی (ہدایت دینے والا)

اللہ تعالیٰ کے ذریعہ بندوں کی پرورش میں پیدا کرنا، رزق دینا اور ہر طرح کی نعمتیں عطا کرنا شامل ہے۔ پرورش کی سب سے اعلیٰ قسم رسولوں کو بھیجنا اور کتابیں نازل کرنا ہے۔

"الرب" الف لام کے ساتھ بطور معرفہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [میرا رب اللہ ہے جس نے میری پرورش کی اور اپنی نعمتوں کے ذریعہ تمام جہان والوں کی پرورش کی، وہی میرا معبود ہے، اس کے سوا کوئی میرا معبود نہیں ہے]

اس جملہ میں توحید ربوبیت اور توحید الوہیت دونوں جمع ہو گیا ہے۔ (ربی اللہ الذی ربانی) کے ذریعہ توحید ربوبیت کا اور (وھو معبودی) کے ذریعہ توحید الوہیت کا اقرار ہے۔

(وھو معبودی لیس معبود سواہ) کہہ کر اثبات و نفی دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے۔ یہ دونوں توحید کے دو ارکان ہیں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "الحمد للہ رب العالمین" اللہ تعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ عالم (جہاں) ہے اور میں اس عالم کا ایک فرد ہوں]

اس میں مصنف رحمہ اللہ کے قول (تمہارا رب کون ہے؟) کی دلیل ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ میرا رب وہ ہے جو سارے جہان والوں کا رب ہے اور میں ان جہان والوں میں شامل ہوں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قل أغير الله أبغي ربا وهو رب كل شيء" (آپ فرما دیجئے کہ کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو رب بنانے کے لئے تلاش کروں حالانکہ وہ مالک ہے ہر چیز کا)

ایسا اس وجہ سے کہ موجودات کی دو قسمیں ہیں: ایک رب جو خالق و مالک اور پالنہار ہے اور دوسرا مربوب یعنی جس کو پالا گیا اور جس کی تخلیق کی گئی۔

مخلوقات کو عالمین اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک اور مدبر کی نشانی ہے۔

"الحمد" میں (الف لام) استغراق کا ہے۔ اس سے مراد ہر قسم کی تعریف ہے جو اس وقت موجود ہے، یا کبھی موجود تھی یا کبھی وجود میں آئے گی ان تمام تعریفوں کا مستحق اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے اللہ کے ساتھ جو لام ہے وہ استحقاق کا ہے۔

حمد کا مطلب ہے محمود سے محبت اور اس کی تعظیم کے ساتھ اس کے لئے صفات کمال کا اعتراف۔

اگر آپ سے کہا جائے کہ آپ نے کیسے اپنے رب کو پہچانا؟

تو آپ کہئے کہ میں نے اپنے رب کی نشانیوں اور اس کی مخلوقات کے ذریعہ اسے پہچانا۔

رات، دن اور سورج، چاند اس کی نشانیاں ہیں۔

اور ساتوں آسمان، ساتوں زمین اور ان دونوں کے اندر اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے سب اللہ کی مخلوقات ہیں۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "ومن آياته الليل والنهار والشمس والقمر لا تسجدوا للشمس ولا للقمر واسجدوا لله الذي خلقهن إن كنتم إياه تعبدون" (اور دن رات اور سورج چاند بھی (اسی کی) نشانیوں میں سے ہیں، تم سورج کو سجدہ نہ کرو نہ چاند کو بلکہ سجدہ اس اللہ کے لئے کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا ہے، اگر تمہیں اسی کی عبادت کرنی ہے تو)

نیز اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: "إن ربكم الله الذي خلق السماوات والأرض في ستة أيام ثم استوىٰ على العرش يغشي الليل النهار يطلبه حثيثا والشمس والقمر والنجوم مسخرات بأمره ألا له الخلق والأمر تبارك الله رب العالمين" (بیشک تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا۔ وہ شب سے دن کو ایسے طور پر چھپا دیتا ہے کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے آلیتی ہے اور سورج اور چاند اور دوسرے ستاروں کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اس کے حکم کے

تابع ہیں۔ یاد رکھو اللہ ہی کے لئے خاص ہے خالق ہونا یا حاکم ہونا، بڑی خوبیوں سے بھرا ہوا ہے اللہ جو تمام عالم کا پروردگار ہے)

اس مذکورہ بالا اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے وجود کی دلیل بیان کی گئی ہے اور اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ وہ تنہا رب ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [آپ نے اپنے رب کو کیسے پہچانا] کا مطلب ہے کہ آپ نے اپنے رب کے وجود کو کیسے پہچانا؟

جب مصنف رحمہ اللہ نے اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کی دلیل ذکر کر دی تو انہوں نے وہ عقلی ذریعہ بھی بیان کر دیا جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے وجود پر استدلال کیا گیا ہے۔ انہوں نے بیان کیا کہ یہ عقلی ذریعہ اللہ کی نشانیاں اور اس کی مخلوقات ہیں۔ انہوں نے ان میں سے چند کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

یہ مذکورہ بالا نشانیاں اللہ کے وجود پر اس طرح دلالت کرتی ہیں کہ یہ سب ایک نظام کے تحت چل رہی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کا ایک رب ہے جو ان کی تدبیر کرتا ہے اور انہیں ایک نظام کے تحت چلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "لا الشمس ينبغي لها أن تدرك القمر ولا الليل سابق النهار وكل في فلك يسبحون" (نہ آفتاب کی یہ مجال ہے کہ چاند کو پکڑے اور نہ رات دن پر آگے بڑھ جانے والی ہے اور سب کے سب آسمان میں تیرتے پھرتے ہیں)

یہ ساری مخلوقات اللہ کے وجود پر بایں طور دلالت کرتی ہیں کہ یہ مخلوقات ہیں، یعنی یہ عدم سے وجود میں آئی ہیں، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ایک رب ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے اور وجود بخشا ہے۔

فوا عجبا كيف يعصى الإله أم كيف يجحده الجاحد

ولله في كل تحريكة وتسكينة أبدا شاهد

وفي كل شيء له آية تدل على أنه الواحد

(تعجب ہے کہ معبود کی نافرمانی کیسے کی جاتی ہے یا کوئی منکر کیسے اس کا انکار کرتا ہے۔ جو بھی چیز حرکت کر رہی ہے یا اپنی جگہ ساکت ہے اللہ تعالیٰ کے موجود ہونے پر دلالت کرتی ہے، ہر چیز اللہ کے وجود کی ایک نشانی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ وہ ایک ہے)

اس طرح دنیا کی ہر چیز کا وجود موجود و معبود کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

تنبیہ: قرآن و سنت میں آیات (نشانیاں) اور مخلوقات کے درمیان فرق ہے۔ نشانیاں عام ہیں اور یہ دو طرح کی ہیں۔

1۔ شرعی نشانیاں: ان سے مراد رسولوں پر اللہ کی نازل کردہ وحی ہے۔

2۔ دنیاوی نشانیاں: ان سے مراد مخلوقات ہیں۔

مصنف رحمہ اللہ نے دونوں کو ایک ہی چیز کے طور پر ذکر کیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے جن نشانیوں کا ذکر کیا ہے وہ دنیاوی نشانیاں (مخلوقات) ہیں۔ انہوں نے بس لفظی طور پر دونوں کے درمیان فرق کیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے جن آیتوں سے استدلال کیا ان سے لفظی موافقت ہے۔

اسی بنا پر مصنف کے قول (بآیاتہ و مخلوقاتہ) میں واو مغایرت کے لئے نہیں ہے بلکہ اس واو کے ذریعہ خاص کو عام پر عطف کیا گیا ہے، اس لئے کہ مخلوقات ہی کونی نشانیاں ہیں۔

رب ہی معبود ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "يا أيها الناس اعبدوا ربكم الذي خلقكم والذين من قبلكم لعلكم تتقون الذي جعل لكم الأرض فراشا والسماء بناء وأنزل من السماء ماء فأخرج به من الثمرات رزقا لكم فلا تجعلوا لله أندادا وأنتم تعلمون" (اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے کے لوگوں کو پیدا کیا، یہی تمہارا بچاؤ ہے۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی اتار کر اس سے پھل پیدا کر کے تمہیں روزی دی، خبردار باوجود جاننے کے اللہ کے شریک مقرر نہ کرو)

ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں: آیت میں جن چیزوں کا تذکرہ ہے ان کا خالق ہی عبادت کا مستحق ہے۔

متن کے اس اقتباس کا خلاصہ: مصنف رحمہ اللہ نے اس میں صرف اللہ تعالیٰ کی الوہیت (معبود ہونے) کا اقرار کرنے کی دلیل بیان کی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [رب ہی معبود ہے] یعنی رب ہی عبادت کے لائق ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے صرف اللہ تعالیٰ کے رب ہونے کی دلیل ذکر کرنے کے بعد صرف اللہ کی الوہیت کے وجوب کی دلیل ذکر کی ہے۔ قرآن میں مشرکین کے لئے توحید الوہیت کو ثابت کرنے کی غرض سے اس اسلوب کا استعمال بکثرت ہوا

ہے۔ ان کے لئے پہلے توحید ربوبیت کا تذکرہ ہوتا ہے جس کا وہ اقرار کرتے ہیں پھر ان کے سامنے توحید الوہیت کو بیان کیا جاتا ہے جس کے وہ منکر ہیں۔ یہ قائل کرنے کا بہت زبردست اسلوب ہے۔[1] اسی لئے ابن کثیر رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ ان چیزوں کا خالق ہی عبادت کا مستحق ہے۔[2]

زیادہ واضح الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آپ یہ اقرار کرتے ہیں کہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی کی دی ہوئی ہیں۔ اسی نے پیدا کیا، رزق عطا کیا، حفاظت کی اور اپنی نگہداشت میں رکھا، اسی کے ہاتھ میں آپ کا نفع و نقصان، صحت و بیماری اور موت و حیات ہے۔۔۔۔ تو پھر آپ غیر اللہ کی عبادت کیوں کرتے ہیں؟! اور غیر اللہ سے نفع کی امید اور نقصان کا اندیشہ کیوں رکھتے ہیں؟!

کسی اہل علم کا قول ہے: جب اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں یکتا و تنہا ہے تو آپ اپنے اعمال کو صرف اسی ایک اللہ کے لئے انجام دیجئے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ جو ذات قصد و ارادہ میں یکتا و تنہا ہے وہ پیدا کرنے میں بھی یکتا و تنہا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔

اس سے پہلے بھی ہم نے یہ وضاحت کی ہے کہ مصنف رحمہ اللہ نے رب تعالیٰ کی پہچان کے تعلق سے جو بات کہی ہے اس میں دو باتیں شامل ہیں:

1۔ وہ رب ہے۔ اس کی دلیل "الحمد لله رب العالمين" ہے۔ یہ توحید ربوبیت ہے۔

2۔ وہی معبود ہے۔ اس کی دلیل "يا أيها الناس اعبدو۔۔۔۔الخ" ہے۔ یہ توحید الوہیت ہے۔

---

1. شیخ ہر اس نے اپنی کتاب "دعوۃ التوحید" میں توحید الوہیت کو ثابت کرنے کے قرآنی طریقے و اسالیب کا تذکرہ کیا ہے۔ تفصیل کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے۔
2. یہ مذکورہ عبارت ابن کثیر رحمہ اللہ کے کلام کا خلاصہ ہے، یہ ان کے الفاظ نہیں ہیں۔ شیخ رحمہ اللہ نے عوام الناس کو سمجھانے کے لئے زیادہ واضح عبارت میں ابن کثیر رحمہ اللہ کی بات کو پیش کیا ہے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کی تفسیر میں ان کے یہ الفاظ منقول ہیں: ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ وہی خالق ہے، وہی رازق ہے، دنیا اور اس میں سکونت پذیر مخلوق کا مالک اور رازق ہے۔ اس کی وجہ سے وہ تنہا اس بات کا مستحق ہے کہ صرف اسی کی تنہا عبادت کی جائے اور کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کیا جائے۔

مصنف رحمہ اللہ کے یہ ثابت کر دینے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ ہی رب ہے، اس لئے کہ وہ تمام جہان والوں کا رب ہے اور وہ ساری نشانیاں اور مخلوقات جن کا وہ ہر دن مشاہدہ کرتا ہے اور جن کے ساتھ وہ زندگی بسر کرتا ہے، یہ رب تعالیٰ کو پہچاننے کا راستہ اور ذریعہ ہے۔ اس کے بعد بندہ کے لئے یہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ صرف اس رب تعالیٰ کی عبادت کرے، اس لئے کہ انسان کسی نہ کسی چیز کی عبادت ضرور کرتا ہے، کچھ نہیں تو وہ اپنی خواہشات کا بندہ بن کر رہ جاتا ہے تو جب کسی چیز کی عبادت اسے کرنی ہی ہے تو پھر وہ اس کی عبادت کرے جو اس کا خالق ہے، جس نے اسے ہر قسم کی نعمتیں عطا کی ہیں اور جو کائنات کی ہر چیز کا خالق ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کا شعر ہے:

هربوا من الرق الذي خُلقوا له فبُلوا برق النفس والشيطان

(لوگ اس غلامی سے بھاگے جس کے لئے پیدا کئے گئے تھے تو نفس اور شیطان کی غلامی میں مبتلا ہو گئے)

اللہ تعالیٰ نے جن عبادات کا حکم دیا ہے ان میں اسلام، ایمان اور احسان شامل ہیں۔ نیز ان میں دعا، خوف، امید، توکل، رغبت و چاہت، ڈر، خشوع، خشیت، انابت (رجوع کرنا)، استعانت (مدد طلب کرنا)، استعاذہ (پناہ طلب کرنا)، استغاثہ (فریاد کرنا)، ذبح (جانور ذبح کرنا)، نذر (منت ماننا) اور ان کے علاوہ عبادت کی وہ تمام اقسام شامل ہیں جن کو اللہ نے اپنے ہی لئے انجام دینے کا حکم دیا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "و أن المساجد لله فلا تدعوا مع الله أحدا" (یہ مسجدیں اللہ ہی کی ہیں لہذا اللہ کے ساتھ کسی اور کو نہ پکارو) جس نے ان عبادات میں سے کسی عبادت کو غیر اللہ کے لئے انجام دیا وہ مشرک و کافر ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "ومن يدع مع الله إلها آخر لا برهان له به فإنما حسابه عند ربه إنه لا يفلح الكافرون" (جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں پس اس کا حساب تو اس کے رب کے اوپر ہی ہے، بیشک کافر لوگ نجات سے محروم ہیں)

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں ان چند عبادات کا تذکرہ ہے جنہیں صرف اللہ کے لئے انجام دینا واجب ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے یہ ثابت کر دینے کے بعد کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود ہے، عبادات کی ان چند قسموں کو ذکر کیا ہے جن کے ذریعہ رب تعالیٰ کی عبادت کی جائے گی۔ ان کو ذکر کرنے کا دو مقصد ہے:

1۔ ان عبادات کے ذریعہ اللہ کی عبادات کی جائے گی اور ان کو ترک نہیں کیا جائے گا۔

2۔ ان عبادات کو غیر اللہ کے لئے انجام نہیں دیا جائے گا، ورنہ وہ شرک ہو گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن يدع مع الله إلها آخر لا برهان له به فإنما حسابه عند ربه إنه لا يفلح الكافرون" (جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو پکارے جس کی کوئی دلیل اس کے پاس نہیں پس اس کا حساب تو اس کے رب کے اوپر ہی ہے، بیشک کافر لوگ نجات سے محروم ہیں)

مصنف رحمہ اللہ نے عبادات کی جن قسموں کو ذکر کیا ہے ان میں سے اکثر قلبی عبادات ہیں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [مثلاً اسلام، ایمان اور احسان]

مصنف کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تینوں عبادت کی قسمیں ہیں۔ اس میں اشکال ہے، اس لئے کہ یہ تینوں دین کی قسمیں اور اس کے درجات ہیں جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مذکور ہے۔ اس حدیث میں دین کے ان تینوں درجات کو ذکر کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ جبریل تھے، تم لوگوں کو تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے۔"

ہم مصنف رحمہ اللہ کے کلام کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ انہوں نے اسلام، ایمان اور احسان کو ذکر کرکے ان سب کے ارکان کو مراد لیا ہے جو عبادات میں داخل ہیں اور یہ بتایا ہے کہ یہ تینوں عبادات کے اصول و بنیاد ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے جب اس کے بعد عبادت کی قسموں کے دلائل ذکر کئے ہیں تو وہاں پر دین کے ان تینوں درجات کے دلائل ذکر نہیں کئے ہیں۔ وہ اسے دوسری اصل کے تحت مفصل طور پر بیان کریں گے، اس لئے کہ یہ دین کی قسمیں ہیں، عبادت کی قسمیں نہیں ہیں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول: وہ مشرک و کافر ہے۔ یہاں انہوں نے مشرک کہا اس لئے کہ اس نے اللہ کے ساتھ غیر اللہ کو شریک کیا اور کافر کہا اس لئے کہ اس نے اللہ کے ایک حق کا انکار کیا کیونکہ اس نے عبادت کو غیر اللہ کے لئے انجام دیا۔

اس سلسلہ میں قاعدہ یہ ہے کہ ہر مشرک کافر ہے لیکن ہر کافر مشرک نہیں ہے۔

حدیث میں آیا ہے: "الدعاء مخ العبادة"[1] (دعا عبادت کا مغز ہے) اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وقال ربكم ادعوني أستجب لكم إن الذين يستكبرون عن عبادتي سيدخلون جهنم داخرين" (اور تمہارے رب کا فرمان (سرزد ہو چکا) ہے کہ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کروں گا، یقین مانو کہ جو لوگ میری عبادت سے خود سری کرتے ہیں وہ ابھی ابھی ذلیل ہو کر جہنم میں پہنچ جائیں گے)

اللہ سے خوف کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "فلا تخافوهم وخافون إن كنتم مؤمنين" (تم ان کافروں سے نہ ڈرو اور میرا خوف رکھو، اگر تم مومن ہو)

اللہ سے امید لگانے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "فمن كان يرجو لقاء ربّه فليعمل عملا صالحا ولا يشرك بعبادة ربه أحدا" (تو جسے بھی اپنے پروردگار سے ملنے کی آرزو ہو اسے چاہئے کہ نیک اعمال کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو بھی شریک نہ کرے)

---

[1] یہ انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جسے امام ترمذی نے نقل کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے۔ اس حدیث کی سند میں ابن لہیعہ ضعیف راوی ہیں لیکن اس کی شاہد نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے جسے امام احمد اور اصحاب سنن اربعہ نے نقل کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "الدعاء هو العبادة" اس حدیث کو بشمول امام ترمذی محدثین کی ایک جماعت نے صحیح قرار دیا ہے۔ ابن حجر نے فتح الباری میں کہا ہے کہ اسے اصحاب سنن نے جید سند سے نقل کیا ہے۔ شیخ البانی نے بھی اسے صحیح کہا ہے۔ "مخ العبادة" کا مطلب ہے عبادت کا اصل جوہر، اس لئے کہ جسم کو دماغ سے غذا حاصل ہوتی ہے، جب دماغ نہیں رہے گا تو جسم بھی ختم ہو جائے گا۔

توکل کرنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" وعلى الله فتوكلوا إن كنتم مؤمنين" (اللہ ہی پر توکل کرو اگر تم مومن ہو) نیز اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "ومن يتوكل على الله فهو حسبه" (جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کے لئے کافی ہو جاتا ہے)

رغبت، ڈر اور خشوع کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" إنهم كانوا يسارعون في الخيرات ويدعوننا رغبا ورهبا وكانوا لنا خاشعين" (یہ بزرگ لوگ نیک کاموں کی طرف جلدی کرتے تھے اور ہمیں لالچ طمع اور ڈر خوف سے پکارتے تھے اور ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے)

خشیت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:"فلا تخشوهم واخشون"(تم ان سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو)

انابت و رجوع کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وأنيبوا إلى ربكم وأسلموا له "(تم (سب) اپنے پروردگار کی طرف جھک پڑو اور اس کی حکم برادری کئے جاؤ)

استعانت (مدد طلب کرنے) کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "إياك نعبد وإياك نستعين"(ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں) اور حدیث میں ہے:" إذا استعنت فاستعن بالله" (جب تم مدد طلب کرو تو اللہ سے مدد طلب کرو)

استعاذہ (پناہ حاصل کرنے) کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "قل أعوذ برب الفلق" (آپ کہہ دیجئے کہ میں صبح کے رب کی پناہ میں آتا ہوں) نیز یہ ارشاد ہے: "قل أعوذ برب الناس" (آپ کہہ دیجئے کہ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ میں آتا ہوں)

استغاثہ (فریاد کرنے) کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "إذ تستغيثون ربكم فاستجاب لكم" (اس وقت کو یاد کرو جب کہ تم اپنے رب سے فریاد کر رہے تھے، پھر اللہ تعالیٰ نے تمہاری سن لی)

جانور ذبح کرنے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "قل إن صلاتي ونسكي[1] محياي ومماتي لله رب العالمين" (آپ فرمادیجئے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا یہ سب خالص اللہ ہی کا ہے جو سارے جہان کا مالک ہے) اور سنت میں اس کی دلیل یہ حدیث ہے: "لعن الله من ذبح لغير الله" (اس پر اللہ کی لعنت ہے جس نے غیر اللہ کے نام پر جانور ذبح کیا)

نذر ماننے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "يوفون بالنذر ويخافون يوما كان شرّه مستطيرا" (جو نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی برائی چاروں طرف پھیل جانے والی ہے)

---

[1] "نسك" کے معنی عبادت کے ہیں، اس کے معنی جانور ذبح کرنے کے بھی ہیں، اس آیت میں جمہور مفسرین کا یہی موقف ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرح ہے: "فصل لربك وانحر" (آپ اپنے رب کے لئے نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے)

اس مذکورہ بالا اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں ان عبادات کے دلائل ذکر کئے ہیں جنہیں مصنف رحمہ اللہ نے پہلے بیان کیا تھا۔

مصنف رحمہ اللہ نے عبادات کی قسموں کو ذکر کرنے کے بعد یہ دلیل ذکر کی ہے کہ اگر کسی نے ان میں سے کسی بھی عبادت کو غیر اللہ کے لئے انجام دیا تو وہ مشرک ہو جائے گا۔ اس کے بعد انہوں نے ان عبادات کے دلائل بیان کئے ہیں جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ یہ ساری کی ساری عبادتیں ہیں اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ساری عبادتیں ہیں تو پھر انہیں غیر اللہ کے لئے انجام دینا شرک اکبر ہے۔

مسئلہ: قرآن کی آیات سے ہم کیسے سمجھیں گے کہ یہ سارے کام عبادات میں شامل ہیں؟

جواب: اس کے لئے ہم عبادت کی تعریف کی طرف رجوع کریں گے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے عبادت کی تعریف اس طرح کی ہے: بندے کے ظاہری و باطنی اقوال و افعال میں سے ہر وہ قول و عمل جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہو وہ عبادت ہے۔

چند اسباب کی بناء پر ہم کسی عمل کو عبادت کے طور پر جانتے ہیں:

1۔ کوئی ایسا کام جس کا حکم دیا گیا ہو تو وہ عبادت ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ صرف ان ہی کاموں کا حکم دیتا ہے جو اس کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہوتا ہے، چاہے وہ واجب ہو یا مستحب۔

2۔ اس کام کی یا اس کام کو کرنے والے کی مدح و ستائش کی گئی ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی صرف ان ہی باتوں کی تعریف کرتا ہے جو اس کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ ہوتی ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: "إن الله يحب التوابين ويحب المتطهرين" (اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک رہنے والوں کو پسند فرماتا ہے) اور یہ ارشاد: "ويدعوننا رغبا ورهبا" (ہمیں لالچ طمع اور ڈر خوف سے پکارتے تھے)

3۔ اس کام پر اجر و ثواب حاصل ہوتا ہو۔

عبادت کو دو اعتبار سے جانا اور پہچانا جا سکتا ہے:

1۔اس کی حقیقت (تعبد) کے اعتبار سے: یعنی جس عبادت میں کمال محبت کے ساتھ کمال تعظیم و خضوع پایا جاتا ہو۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: عبادت میں آخری درجہ کی محبت کے ساتھ آخری درجہ کا تذلل پایا جاتا ہے اور اس کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ الجواب الکافی میں رقمطراز ہیں: معبود ہونے کی خصوصیات میں سے یہ ہے کہ اس کے لئے ایسی عبودیت (بندگی) اختیار کی جائے جو اپنی دو اصل پر قائم ہو، ان دونوں کے سوا اس کی کوئی اصل نہیں ہے اور وہ ہے: آخری درجہ کی محبت اور آخری درجہ کا تذلل و مسکنت۔ مکمل عبودیت (بندگی) یہی ہے۔ ان دونوں اصل میں تفاوت کے بقدر عبادت کے معاملہ میں انسانوں کے درمیان درجات میں تفاوت ہوتا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ مدارج السالکین میں رقمطراز ہیں: عبادت میں دو اصل کا پایا جانا ضروری ہے، ایک آخری درجہ کی محبت اور دوسرے آخری درجہ کا تذلل و خضوع۔ عرب اس راستہ کو "طریق معبّد" کہتے ہیں جو بہت روندا ہوا ہو یعنی جس راستہ پر لوگ بکثرت چلتے ہوں۔ تعبد سے مراد تذلل و خضوع ہے۔ آپ کو جس سے محبت ہو لیکن آپ اس کے سامنے جھکتے نہ ہوں تو آپ اس کے عبادت گزار نہیں کہلائیں گے، اسی طرح آپ کسی سے محبت کئے بغیر اس کے سامنے جھکیں تب بھی آپ اس کے عبادت گزار نہیں کہلائیں گے۔ عبادت کا اطلاق تبھی ہوگا جب آپ محبت بھی کریں اور جھکیں بھی۔

ابن قیم رحمہ اللہ اپنے قصیدہ نونیہ میں کہتے ہیں:

وعبادة الرحمٰن غاية حبه مع ذل عابده هما قطبان

(رحمٰن کی عبادت کا مطلب ہے اس سے آخری درجہ کی محبت کے ساتھ اس کے سامنے ذلت و مسکنت کا اظہار۔ یہ دونوں چیزیں عبادت کی بنیاد ہے۔)

2۔اس کے افراد کے اعتبار سے: اس سے مراد وہی ہے جو ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تعریف کی ہے یعنی بندے کے ظاہری و باطنی اقوال و افعال میں سے ہر وہ عمل یا قول عبادت ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب و پسندیدہ ہو۔

تنبیہ: مذکورہ بالا سارے اعمال عبادات ہیں۔ انہیں بطور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کے لئے انجام دینا جائز ہے۔ جس نے ان کاموں کو بطور عبادت غیر اللہ کے لئے انجام دیا وہ شرک اکبر میں ملوث ہو گیا، العیاذ باللہ۔ یہ کام غیر تعبدی طور پر غیر اللہ کے لئے بھی انجام دیئے جاتے ہیں۔ ایسا کرنا جائز ہے، ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ہے جو اِن شاء اللہ کتاب التوحید کی شرح میں آئے گی، اس لئے کہ مصنف رحمہ اللہ نے کتاب التوحید میں ابواب اس کے لئے خاص کئے ہیں۔ یہ مختصر رسالہ ان تفصیلات کا متحمل نہیں ہے۔

پہلی اصل کا خلاصہ: یہ ہے کہ رب تعالیٰ جو ہمارا خالق ہے، نے اپنی پہچان کے لئے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور اس کائنات کے انتظام و انصرام کی شکل میں بہت سے دلائل پیش کر دیئے ہیں۔ جس نے ان کاموں کو تنہا انجام دیا ہو تنہا اسی کی عبادت کرنا واجب ہے، چاہے وہ قلبی عبادات ہوں یا عملی عبادات۔ جس نے کسی قسم کی عبادت کو غیر اللہ کے لئے انجام دیا وہ شرک اکبر میں مبتلا ہو گیا۔

دوسری اصل: دلائل کے ذریعہ دین اسلام کو جاننا ہے۔ اسلام کا مطلب ہے توحید کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے سامنے خود سپردگی کرنا، اللہ کی اطاعت کے ذریعہ اس کی فرمانبرداری کا اظہار کرنا اور شرک و مشرکین سے اظہار براءت کرنا۔

اس کے تین درجات ہیں: اسلام، ایمان اور احسان۔

ان میں سے ہر درجہ کے کچھ ارکان ہیں۔

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں دوسری اصل کا بیان ہے۔ یہ اصل دین کو جاننے اور اس کی معرفت حاصل کرنے سے متعلق ہے۔ اس کے تین درجات ہیں اور ہر درجہ کے چند ارکان ہیں۔

مصنف رحمہ اللہ [دلائل کے ذریعہ دین اسلام کو جاننا] یہاں پر اس سے مراد اسلام ہے، اس کے عام معنی ومفہوم کے اعتبار سے اس کے تینوں درجات کے ساتھ۔ اس لئے کہ جب مطلق طور پر اسلام بولا جاتا ہے تو اس میں ایمان شامل ہوتا ہے۔ اسی طرح جب مطلق طور پر ایمان بولا جاتا ہے تو اس میں اسلام شامل ہوتا ہے اور اس وقت وہ دین کے معنی میں ہوتا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اس کا مطلب ہے توحید کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے سامنے استسلام (خود سپردگی کرنا)] استسلام تسلیم سے مشتق ہے۔ استسلم فلان للقتل کا مطلب ہوتا ہے فلان نے اپنے آپ کو قتل کے لئے حوالہ کر دیا، اس نے خود سپردگی کر دی اور اس کے لئے تیار ہو گیا۔

یہ استسلام (خود سپردگی) دو طرح کی ہے:

1۔ شرعی خود سپردگی: اس کے لئے اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور صرف اللہ کی عبادت ضروری ہے۔ بندہ سے یہی مطلوب بھی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ تعریف کا مستحق بنتا ہے اور اسے اجر وثواب حاصل ہوتا ہے۔

2۔ تقدیر کے سامنے خود سپردگی: اس میں انسان کا کوئی حیلہ وتدبیر کام نہیں آتا ہے اور نہ اس پر اسے ثواب ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وله أسلم من في السماوات والأرض طوعا وكرها وإليه يرجعون" (تمام آسمان والے اور سب زمین والے اللہ تعالیٰ ہی کے فرمانبردار ہیں، خوشی سے ہوں یا ناخوشی سے، سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اطاعت کے ذریعہ اس کی فرمانبرداری کا مظاہرہ] اس کے لئے ان کاموں کو کرنا ضروری ہے جن کا حکم دیا گیا ہے اور جن کاموں سے منع کیا گیا ہے ان سے بچنا ضروری ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ دائرہ اسلام میں آنے کے بعد عمل ضروری ہے اور یہ عمل اختیاری ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ اس سے شیخ کی مراد شرعی احکام کے سامنے خود سپردگی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [شرک اور مشرکین سے اظہار براءت] یہاں شیخ رحمہ اللہ نے کلمہ کی شہادت دینے کے لوازمات کو بیان کیا ہے یعنی شرک اور مشرکین سے اظہار براءت کرنا۔ یہ دین کے اصول میں سے ایک اصل ہے۔ کسی شخص کے مسلمان ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اندر یہ تینوں چیزیں پائی جائیں جن کا ذکر مصنف نے اسلام کی

تعریف کے تحت کیا ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز نہ پائی جائے تو وہ مسلمان نہیں شمار ہو گا۔ اگر وہ اللہ کے لئے توحید کا اقرار کرے لیکن اس پر عمل نہ کرے تو وہ کافر ہو گا۔ اگر وہ بس ظاہری طور پر عمل کرے اور دل سے اللہ کے سامنے خود سپردگی نہ کرے تب بھی وہ کافر ہو گا، جیسا کہ کلی طور پر نفاق کے شکار لوگوں کی حالت ہے۔ اگر کوئی شخص شرک سے نفرت و بغض نہ کرتا ہو اور اس سے اظہار براءت نہ کرتا ہو تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام اور مسلمانوں سے محبت کرتا ہو لیکن وہ شرک اور مشرکین سے نفرت نہ کرتا ہو تو وہ مسلمان نہیں ہے۔[1]

تنبیہ: شیخ ابراہیم خریصی نے اپنی کتاب "التنبیهات المختصرة" میں لکھا ہے کہ "الأصول الثلاثة" کے کچھ نسخے میں "البراءة" کے بجائے "الخلوص من الشرك و أهله" (شرک اور مشرکین سے چھٹکارا وگلو خلاصی) کے الفاظ آئے ہیں، لیکن قابل اعتماد نسخوں میں "البراءة" کا لفظ آیا ہے، اس لئے کہ شرک سے صرف گلو خلاصی و چھٹکارا کافی نہیں ہے، اس کے ساتھ مشرکین سے اظہار براءت اور ان کی تکفیر بھی ضروری ہے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا: "كفرنا بكم وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء أبدا حتى تؤمنوا بالله وحده" (ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں جب تک تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کے لئے بغض وعداوت ظاہر ہو گئی)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اس کے تین مرتبے (درجات) ہیں: اسلام، ایمان اور احسان]

مرتبہ سے مراد منزل، مقام اور درجہ ہے۔ مصنف نے یہ نہیں کہا کہ اس کی تین قسمیں ہیں تاکہ یہ معلوم ہو کہ اس سے مراتب اور درجات مراد ہیں۔ ایک درجہ دوسرے درجہ سے اوپر ہے۔ مسلمان، مومن اور محسن سب دین اسلام ہی کے پیروکار ہوتے ہیں لیکن ہر ایک کا اپنا ایک خاص مقام و مرتبہ ہے۔

اسلام یہ ہے کہ ظاہری اعمال کو انجام دیا جائے اور اس کے ساتھ ایمان کا کچھ حصہ بھی ہو جس کی بناء پر یہ ظاہری اعمال صحیح قرار پا سکیں ورنہ وہ منافق کے زمرہ میں شامل ہو جائے گا۔

---

[1] اگر کوئی شخص اصل کے اعتبار سے شرک اور مشرکین سے نفرت کرتا ہے لیکن کسی دنیوی مقصد کی خاطر کچھ مشرکین سے محبت کرتا ہے تو یہ کفر اکبر نہیں ہے لیکن اس کی وجہ سے اس کے ایمان میں کمی واقع ہوتی ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: کبھی کسی مومن کو کسی مشرک سے رشتہ داری یا کسی ضرورت کی وجہ سے محبت ہوتی ہے۔ یہ گناہ ہے، اس سے ایمان میں کمی واقع ہوتی ہے لیکن اس کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہو گا جیسا کہ صحابی رسول حاطب بن ابی بلتعہ کے واقعہ سے ظاہر ہوا۔

ایمان یہ ہے کہ اس کے تمام چھ ارکان پر ایمان لایا جائے، یہ ایمان دل میں بھی جاگزیں ہو ساتھ ہی اسلام کے چند ظاہری اعمال کو بھی انجام دیا جائے جس کی وجہ سے یہ باطنی ایمان صحیح قرار پاسکے ورنہ وہ اپنے ایمان کے دعوے میں جھوٹا ہو گا۔

احسان وہ مقام ہے جب مومن اللہ تعالیٰ کی نگرانی کا تصور کرنے لگے۔

ابن ابی شیبہ کا قول ہے: اسلام کا وجود ایمان سے ہے اور ایمان کا وجود اسلام سے ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہے۔

شیخ ابن باز کا قول ہے: ایمان کے بغیر اسلام کا وجود نہیں اور اسلام کے بغیر ایمان کا وجود نہیں ہے۔ ان دونوں کا ایک ساتھ ہونا ضروری ہے۔

مسئلہ: شیخ رحمہ اللہ نے یہاں ذکر کیا ہے کہ دلائل کے ساتھ دین کا علم ہونا واجب ہے۔ شیخ رحمہ اللہ نے پہلے رسالہ میں کہا تھا: (پہلی چیز علم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور اس کے نبی کو جاننا اور پہچاننا اور دین اسلام کو دلائل کے ذریعہ جاننا) یہاں پر انہوں نے کہا ہے: (دین اسلام کو دلائل کے ذریعہ جاننا)

یہ مسئلہ علماء کے یہاں عقائد اور اصول دین میں تقلید کا مسئلہ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے یا دلیل کو جاننا ضروری ہے؟

اس مسئلہ میں علماء کے مختلف اقوال ہیں: کچھ علماء نے دلیل کے ذریعہ علم کو واجب کہا ہے، کچھ علماء نے غور وفکر کو واجب کہا ہے، کچھ علماء نے مطلق طور پر تقلید کی اجازت دی ہے، کچھ علماء نے جزم (پختہ یقین) کی شرط کے ساتھ اجازت دی ہے اور کچھ علماء نے عقائد کے ظاہری اور پوشیدہ مسائل کے درمیان فرق کیا ہے۔

حق بات یہ ہے کہ علم کے ساتھ دلیل کے واجب ہونے کی کوئی صحیح وصریح دلیل موجود نہیں ہے اور نہ غور وفکر کے واجب ہونے کی کوئی دلیل ہے۔ اس بناء پر صحیح موقف یہ ہے کہ اس مسئلہ میں تقلید جائز ہے جبکہ تقلید کرنے والے کو اس مسئلہ میں کسی بھی ذریعہ سے پختہ یقین حاصل ہو جائے اور اسے کسی طرح کا شک وتردد نہ ہو۔ واللہ اعلم

یہاں پر یہ بتا دینا مناسب ہے کہ یہ مسئلہ متکلمین کے اٹھائے ہوئے مسائل میں سے ایک ہے۔ یہ مسئلہ صحابہ و تابعین کے دور میں موجود نہیں تھا اور شرعی دلائل میں بھی کوئی ایسی چیز مذکور نہیں ہے جو خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ کی نشاندہی کرتی ہو۔ واللہ اعلم

نووی رحمہ اللہ کہتے ہیں: توحید و رسالت کی گواہی دینے والا حقیقی مومن ہے، اگرچہ وہ اس مسئلہ میں علمائے محققین اور جمہور سلف و خلف کے مذہب کا مقلد ہو، اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومن ہونے کے لئے صرف اس کلمہ اور شریعت کی تصدیق کرنے پر اکتفاء کیا جو آپ لے کر آئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دلیل کے ذریعہ دین کو جاننے اور پہچاننے کی شرط نہیں لگائی تھی۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: جہاں تک اصولی مسائل کا تعلق ہے تو بہت سے متکلمین اور ہمارے اصحاب میں سے فقہاء وغیرہ ہر مومن کے لئے غور و فکر اور استدلال کو واجب قرار دیتے ہیں، یہاں تک کہ عوام الناس اور خواتین کے لئے بھی۔۔۔۔ لیکن جمہور امت کا موقف اس کے برخلاف ہے۔ ان کے نزدیک جو علم واجب ہے وہ اس پر واجب ہے جو اس علم کی تحصیل پر قدرت رکھتا ہو۔ بہت سے عوام الناس اصول و عقائد کی ان باریکیوں کا علم حاصل کرنے سے قاصر ہیں لہذا انہیں اس علم کو حاصل کرنے کا مکلف کیسے بنایا جا سکتا ہے؟ نیز علم کے حصول کا کوئی ایک طریقہ نہیں ہے بلکہ اس کے متعدد طریقے اور راستے ہیں علم کبھی خصوصی غور و فکر کے بغیر حاصل ہوتا ہے، کبھی دوسرے طریقوں مثلاً اضطراری حالت میں کشف کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے نیز جس کے بارے میں انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ راہ راست پر ہے اس کی تقلید کے ذریعہ بھی علم حاصل ہوتا ہے، وغیرہ۔

سفارینی رحمہ اللہ کہتے ہیں: حق بات جس سے انحراف ممکن نہیں اور کسی کے لئے اسے تسلیم کئے بغیر چارۂ کار نہیں ہے، یہ ہے کہ اس شخص کا ایمان بالکل صحیح ہے جو اس معاملہ میں کسی کی صحیح طور پر پختہ یقین کے ساتھ تقلید کرنے والا ہو۔ ایمان کے معاملہ میں غور و فکر اور استدلال واجب نہیں ہے۔ نیز یہ کہ صحیح تقلید سے علم و معرفت حاصل ہوتی ہے۔

ہمارے شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ نے ان مسائل میں تقلید کے صحیح ہونے کو واضح کر دیا ہے جن میں پختہ یقین مطلوب ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ واضح کر دیا ہے کہ اِس طرح کے تقلید کی ممانعت کا قول ضعیف ہے۔

جو لوگ اصولی اور عقائدی مسائل میں تقلید کے قائل ہیں ان کا استدلال اِس آیت کریمہ سے ہے: "فاسألو اهل الذكر إن كنتم لا تعلمون" (پس اگر تم نہیں جانتے تو اہل علم سے دریافت کرو) اِس آیت میں اہل علم سے صرف پوچھنے اور دریافت کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم توحید ورسالت کی گواہی دینے والے اسلام کو قبول کرتے وقت اس کی دلیل یاد کرنے کا حکم نہیں دیتے تھے۔ نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مجھے لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ کلمہ توحید "لا إلٰہ إلا اللہ" کا اقرار کرلیں۔ جس نے اِس کلمہ کا اقرار کیا اُس کا مال اور اس کی جان مجھ سے محفوظ ہوگئی مگر حق کے ساتھ اور اس کا حساب وکتاب اللہ کے ذمہ ہے۔ (متفق علیہ)

یہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف گواہی حاصل کرنے پر اکتفا کیا ہے، اس کے دلیل کے واجب ہونے یا اس میں غور وفکر کرکے واجب ہونے کا یہاں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔

شیخ صدیق حسن خان نے اپنی کتاب "الدین الخالص" میں اس مسئلہ پر طویل کلام کیا ہے۔ اس میں سب سے اچھی چیز جو انہوں نے بیان کی ہے وہ فتح الباری میں منقول حافظ ابن حجر کا یہ قول ہے: تعجب خیز بات یہ ہے کہ اہل کلام میں سے جو لوگ ایمانیات کے معاملہ میں دلیل اور غور وفکر کی شرط لگاتے ہیں اور تقلید کا انکار کرتے ہیں وہی لوگ تقلید کے اولین داعی ہیں، یہاں تک کہ ذہنوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ جس نے اِن اہل کلام کے متعین کردہ اصول وقواعد میں سے کسی قاعدہ کا انکار کیا وہ بدعتی ہے، اگرچہ وہ اس قاعدہ کو نہ سمجھے اور اس کے ماخذ سے وہ واقف نہ ہو تب بھی اس کے لئے اس قاعدہ کو آنکھ بند کرکے مان لینا ضروری ہے۔ اہل کلام کی یہ روش تقلید ہی تو ہے۔

شیخ عبد الرحمن براک کہتے ہیں: معتزلہ وغیرہ میں سے متکلمین کی ایک جماعت اعتقادی مسائل میں تقلید کی حرمت کی قائل ہے۔ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ مسلمانوں میں سے عوام الناس دلائل سے ناواقف ہونے کی وجہ سے گنہگار ہیں یا مسلمان ہی نہیں ہیں۔ اس نظریہ کا فساد بالکل ظاہر اور واضح ہے۔

رہا شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کا یہ قول (دلائل کے ذریعہ دین اسلام کو جانے اور پہچانے) تو وہ اپنی جگہ صحیح ہے، اس لئے کہ ایک مسلمان کے لئے اپنے دینی امور کو قرآن وسنت کے دلائل کے ذریعہ جاننا واجب ہے جبکہ وہ اس پر قادر ہو۔ یہ وجوب کچھ مسائل میں فرض عین ہے جبکہ کچھ دوسرے مسائل میں فرض کفایہ ہے۔

دین اسلام کی اصل اللہ تعالیٰ کو جاننا اور اس پر ایمان لانا ہے۔ یہ چیز غور و فکر اور استدلال سے حاصل ہوتی ہے اور یہ چیز اس فطرت سے بھی حاصل ہوتی ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے جبکہ وہ فطرت تبدیل نہیں ہوئی ہو۔ اللہ تعالیٰ کو جاننے کے لئے غور و فکر اور استدلال کی شرط لگانے کے معاملہ میں اہل علم کا اختلاف ہے۔ غور و فکر اور استدلال کے بغیر بندہ کا اسلام صحیح ہو گا یا نہیں؟ اِس معاملہ میں علماء کے کئی مذاہب ہیں جنہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: وہ غور و فکر جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اس کے واجب ہونے کے مسئلہ میں نظریہ سازوں کا اختلاف ہے۔ اس سلسلہ میں تین اقوال ہیں:

ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ غور و فکر ہر ایک کے لئے واجب ہے۔

دوسری جماعت کہتی ہے کہ یہ ہر ایک کے لئے واجب نہیں ہے۔

جمہور کا موقف یہ ہے کہ یہ کچھ لوگوں کے لئے واجب ہے لیکن سب کے لئے واجب نہیں ہے۔ جسے معرفت حاصل ہو گئی ہو اس کے لئے واجب نہیں ہے۔ جسے اللہ کی معرفت اور اس پر ایمان غور و فکر ہی سے حاصل ہو سکتا ہو اس کے لئے واجب ہے۔ متعدد علماء نے ذکر کیا ہے کہ جمہور مسلمانوں کا یہی قول ہے جیسا کہ ابو محمد بن حزم نے اپنی مشہور کتاب "الفصل في الملل والنحل" میں بھی جمہور مسلمانوں کے اس موقف کو بیان کیا ہے۔ وہ ایک مسئلہ کے ضمن میں کہتے ہیں: استدلال کے بغیر جو شخص اسلام کے عقیدے کو اختیار کر لے کیا وہ مومن شمار ہو گا یا یہ کہ مومن و مسلمان صرف وہی شخص ہو گا جو استدلال سے واقف ہو؟

اِس مسئلہ میں تمام اہل اسلام اِس بات کے قائل ہیں کہ ہر وہ شخص نے جس نے بغیر شک کے دل سے اسلام کے عقیدے کو مان لیا اور زبان سے "أشهد أن لا إلٰه إلا الله وأن محمدا رسول الله" کہہ دیا نیز اس نے یہ اقرار کر لیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو شریعت لے کر آئے ہیں وہ برحق ہے اور وہ دین محمد کے سوا ہر دین سے بری الذمہ ہو گیا تو وہ مسلمان ہے، مومن ہے۔

ایمان کی تکمیل کے لئے اس کے ذمہ اور کچھ نہیں ہے۔(درء تعارض العقل والنقل (۷/ ۵۰۴-۴۰۵۷) سے اختصار کے ساتھ منقول) [1]

---

[1] اس مسئلہ پر جن لوگوں نے کلام کیا ہے اُن میں سے کچھ لوگ منع تقلید کے سبب کی وضاحت کرتے ہوئے تقلید سے منع کرنے والے اہل سنت اور اہل کلام کی باتوں کو آپس میں گڈ مڈ کر دیتے ہیں جیسا کہ وہاں مذکورہ شکلوں کو آپس میں گڈ مڈ کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر شیخ عبد اللہ ابابطین نے نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اصول دین کے معاملہ میں تقلید جائز نہیں ہے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ذکر کیا کہ یہ عام اہل علم کا موقف ہے، اس لئے کہ اس کے دلائل ظاہر اور واضح ہیں دیکھئے: الدرر السنیۃ (۲۱/ ۳۴۱اور ۱۷۱)

اِسی کے ساتھ شیخ عبد اللہ ابابطین نے الدرر السنیۃ (۴/ ۹۳۳) میں کہا ہے کہ ہر ایک کے لئے توحید اور ارکان اسلام کو دلیل کے ذریعہ جاننا فرض ہے، اس معاملہ میں تقلید جائز نہیں ہے، لیکن ایک عام آدمی جو دلائل سے واقف نہیں ہے جب وہ رب تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا عقیدہ رکھتا ہے، وہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے اور جنت و جہنم پر ایمان رکھتا ہے نیز وہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ وہ تمام شرکیہ کام جو مزاروں اور شہادت گاہوں کے پاس انجام دیئے جاتے ہیں باطل پرستی اور گمراہی پر مبنی ہیں، اگر اِن تمام باتوں پر اس کا پختہ اعتقاد ہو اور اس معاملے میں اُسے کوئی شک نہ ہو تو وہ مسلمان ہے اگرچہ اس کی دلیل اُسے نہ بتائی گئی ہو، اس لئے کہ عام مسلمان کو اگر دلیل سمجھائی جائے تو وہ غالبا اس کا معنی و مفہوم نہیں سمجھ پاتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں متنبہ کر دیا گیا ہے تاکہ اہل علم کی طرف وہ بات منسوب نہ کی جائے جس کا انہوں نے قصد نہیں کیا۔

اسلام کے پانچ ارکان ہیں: اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکاۃ ادا کرنا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا۔

توحید کی شہادت دینے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:"شهد ٱلله أنه لا إله إلا هو والملائكة أولوا العلم قائما بالقسط لا إله إلا هو العزيز الحكيم "(اللہ تعالیٰ، فرشتے اور اہل علم اِس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ عدل کو قائم رکھنے والا ہے، اس غالب اور حکمت والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔(لا إلٰہ) سے ان تمام باطل معبودوں کی نفی کی گئی ہے جنہیں اللہ کو چھوڑ کر پوجا جاتا ہے اور (إلا اللّٰہ) کے ذریعہ ایک اللہ کی عبادت کو ثابت کیا ہے جس کا کوئی عبادت میں شریک نہیں ہے اور نہ ملکیت میں اس کا کوئی شریک ہے۔

اِسی مفہوم کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد سے بھی ہوتی ہے:"وإذ قال إبراهيم لأبيه وقومه إنني براء مما تعبدون إلا الذي فطرني فإنه سيهدين وجعلها كلمة باقية في عقبه لعلهم يرجعون "(اور جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے والد سے اور اپنی قوم سے فرمایا کہ میں ان چیزوں سے بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو بجز اس ذات کے جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور وہی

مجھے ہدایت بھی کرے گا اور (ابراہیم علیہ السلام) اِسی کو اپنی اولاد میں بھی باقی رہنے والی بات قائم کر گئے تاکہ لوگ (شرک سے) باز آتے رہیں)

نیز اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد سے بھی اِس مفہوم کی وضاحت ہوتی ہے: "قل يا أهل الكتاب تعالوا إلىٰ كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا ٱلله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضاً أربابا من دون ٱلله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون" (آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب ایسی انصاف والی بات کی طرف آؤ جو ہم میں تم میں برابر ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں، نہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر آپس میں ایک دوسرے کو ہی رب بنائیں، پس اگر وہ منہ پھیر لیں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلمان ہیں)

اس بات کی شہادت دینے کی دلیل کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "لقد جاءكم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمؤمنين رءوف رحيم" (تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہشمند رہتے ہیں، ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں)

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے جن کاموں کا حکم دیا ہے ان کی تعمیل کی جائے، آپ نے جو خبر دی ہے اس کی تصدیق کی جائے اور جن باتوں سے آپ نے منع کیا ہے ان سے اجتناب کیا جائے اور آپ کے مشروع کردہ طریقہ کے مطابق اللہ کی عبادت کی جائے۔

نماز اور زکاۃ کی دلیل اور توحید کی مزید وضاحت اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد میں ہے: "وما أمروا إلا ليعبدوا اللہ مخلصين له الدين حنفاء ويقيموا الصلاة ويؤتوا الزكاة وذلك دين القيمة" **(انہیں اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا کہ صرف اللہ کی عبادت کریں اسی کے لئے دین کو خالص رکھیں، ابراہیم حنیف کے دین پر اور نماز کو قائم رکھیں اور زکاۃ دیتے رہیں یہی ہے دین سیدھی ملت کا)**

روزہ کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "يا أيها الذين آمنوا كتب عليكم الصيام كما كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون" **(اے ایمان والو! تم پر روزے رکھنا فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم تقوی اختیار کرو)**

حج کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وللہ على الناس حج البيت من استطاع إليه سبيلا ومن كفر فإن اللہ غنيّ عن العالمين" **(اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر جو اس کی طرف راہ پاسکتے ہوں اس گھر کا حج فرض کر دیا ہے اور کوئی کفر کرے تو اللہ تعالیٰ (اس سے بلکہ) تمام دنیا سے بے پرواہ ہے)**

اِس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اِس میں دین کے پہلے درجہ یعنی اسلام کے ارکان کو ذکر کیا گیا ہے اور ان میں سے ہر رکن کی دلیلیں ذکر کی گئی ہیں۔

مصنف نے بیان کیا ہے کہ اسلام کے پانچ ارکان ہیں۔ انہوں نے ان ارکان کو مجمل طور پر ذکر کیا ہے پھر ان کے ارکان ہونے کے دلائل ذکر کئے ہیں۔

ارکان اسلام کی جامع دلیل صحیحین میں منقول عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے، اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا زکاۃ ادا کرنا، حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا"۔

چونکہ شیخ رحمہ اللہ کے اِس رسالہ کی تالیف کا بنیادی مقصد توحید عبادت کو خصوصی اہتمام کے ساتھ واضح کرنا ہے لہذا انہوں نے پہلے رکن اسلام یعنی شہادتین کی تفصیلی طور پر وضاحت کی ہے، اس کے معنی و مفہوم کو بیان کیا ہے اور اس کی دلیل ذکر کی ہے۔ انہوں نے باقی ارکان اسلام کے صرف دلائل ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔ ان کی دیگر تفصیلات و جزئیات کے لئے کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اسلام کے پانچ ارکان ہیں]

اسلام کے دو معانی ہیں۔

ا۔ اسلام کا عام معنی: اس سے مراد اللہ کی وحدانیت کا اقرار اور ہر زمانہ میں جو رسول تھے ان کی اطاعت و اتباع ہے۔

اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات میں یہ خبر دی ہے کہ گزشتہ تمام شریعتوں میں اللہ تعالیٰ کے سامنے خود سپردگی کی تعلیم تھی۔ اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام کے بارے میں ارشاد فرمایا: "فإن توليتم فما سألتكم من أجر إن أجري إلاّ على الله وأمرت أن أكون من المسلمين" (پھر بھی اگر تم اعراض ہی کئے جاؤ تو میں نے تم سے کوئی معاوضہ تو نہیں مانگا، میرا معاوضہ تو صرف اللہ ہی ذمہ ہے اور مجھ کو حکم کیا گیا ہے کہ میں مسلمانوں میں سے رہوں) اللہ تعالیٰ نے ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے بارے میں فرمایا: "ربنا واجعلنا مسلمين لك" (اے ہمارے رب ہمیں اپنا فرمانبردار بنالے) اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: "فما وجدنا فيها غير بيت من المسلمين" (اور ہم نے وہاں مسلمانوں کا صرف ایک ہی گھر پایا) اللہ تعالیٰ نے فرعون کے بارے میں خبر دی ہے کہ جب اُسے آنکھوں کے سامنے ہلاکت نظر آنے لگی تو اس نے یہ کہا تھا: "قال آمنت أنّه لا إله إلا الذي آمنت به بنو إسرائيل وأنا من المسلمين" (کہنے لگا کہ میں ایمان لاتا ہوں کہ جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے ہیں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں) یعنی موسیٰ علیہ السلام کے متبعین میں سے ہوں۔

اِسی بنیاد پر موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں یہود اور عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں نصاری مسلمان تھے جبکہ وہ اپنے رسولوں کی اتباع کرنے والے ہوں لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد وہ تبھی مسلمان کہے جائیں گے جب وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کی اتباع کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين "(جو شخص اسلام کے سوا اور دین تلاش کرے اس کا دین قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان پانے والوں میں ہو گا)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی ہے: "قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے، اس امت کا جو بھی فرد میری رسالت کے بارے میں سنے چاہے وہ یہودی ہو یا نصرانی پھر وہ میری لائی ہوئی شریعت پر ایمان لائے بغیر مر جائے وہ جہنمیوں میں شامل ہو گا۔" (صحیح مسلم)

یہ اسلام کا خاص معنی ہے۔

۲- اسلام کا خاص معنی: اِس سے مراد وہ دین ہے جس کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، اس لئے کہ اِس نے سابقہ تمام ادیان کو منسوخ کر دیا ہے۔ جب مطلق طور پر اسلام بولا جائے تو اس سے یہی دین اسلام مراد ہوتا ہے جس کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [شہادت توحید کی دلیل اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "شهد ٱلله أنه لا إله إلاّ هو والملائكة وأولوا العلم قائما بالقسط..... "]

اِس آیت کریمہ میں شہادۃ سے مراد قطعی خبر ہے۔

اِس آیت میں لفظ شھادۃ کا اطلاق "لا إله إلا الله" کی شہادت دینے پر کیا گیا ہے اس لئے کہ یہ دنیا کی سب سے بڑی شہادت ہے اور جس کے حق میں شہادت دی گئی ہے وہ ذات بھی عظیم الشان ہے، لہذا اِس کا اطلاق صرف توحید کی شہادت پر ہو گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس شہادت سے زیادہ عظیم، زیادہ اہم اور زیادہ ثابت شدہ کوئی دوسری شہادت نہیں ہو سکتی ہے، اِس لئے کہ اِس میں اللہ تعالیٰ خود اپنی الوہیت کی شہادت دے رہا ہے۔

آیت سے وجہ استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے یہ گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اِسی طرح فرشتوں اور اہل علم نے بھی گواہی دی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اِس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔(لا اِلہ) کے ذریعہ اُن تمام معبودوں کی نفی کی گئی ہے اللہ کو چھوڑ کر جن کی پرستش کی جاتی ہے اور (اِلاّاللہ) کے ذریعہ ایک اللہ کی عبادت کو ثابت کیا گیا ہے جس کا عبادت میں کوئی شریک نہیں ہے جیسے کہ ملکیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے]

اللہ تعالیٰ کی توحید کی شہادت دینے کا یہی مطلب ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جس کی بھی پرستش کی گئی ہے وہ باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ذلك بأن الله هو الحق وأن ما يدعون من دونه الباطل وأن الله هو العلي الكبير "(یہ سب اس لئے کہ اللہ ہی حق ہے اور اس کے سوا جسے یہ پکارتے ہیں وہ باطل ہے اور بے شک اللہ ہی بلندی والا کبریائی والا ہے)

جو توحید کی شہادت کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا اور رزق عطا کرنے والا نہیں ہے، تو یہ مطلب باطل ہے اگر اِسی پر انحصار کیا جائے۔ کچھ لوگ توحید کی شہادت کا مطلب یہ نکالتے ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی نئی نئی چیزیں پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، کچھ لوگ اِس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ اشیاء کی ذات سے فاسد یقین کو نکالنا اور اللہ کی ذات پر یقین صادق کو داخل کرنا۔ شہادت توحید کے یہ سارے معانی و مفاہیم غلط اور باطل ہیں۔

شہادت توحید سے متعلق اِن باطل اقوال کا مفصل جواب "کشف الشبہات" کی شرح میں آئے گا ان شاء اللہ۔

شیخ رحمہ اللہ "کشف الشبہات" میں کہتے ہیں: تعجب اس شخص پر ہے جو اسلام کا دعویدار ہے لیکن وہ اس کلمۂ توحید کے مطلب و مفہوم کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتا جتنا کفار کے جہلاء جانتے ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ شہادت توحید صرف حروف کو زبان سے ادا کرنے کا نام ہے، اس کے مفہوم کا دل میں اعتقاد رکھنا ضروری نہیں ہے۔ اسلام کے اِن دعویداروں میں

جو ہوشیار ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اِس کا مطلب ہے: اللہ کے سوا کوئی پیدا کرنے والا، رزق دینے والا اور معاملات کی تدبیر کرنے والا نہیں ہے۔ اس آدمی میں کوئی خیر نہیں ہے جو لا اِلہ اِلا اللہ کے معنی و مفہوم کا علم رکھنے کے معاملہ میں کفار کے جہلاء سے بھی کمتر ہے۔ شیخ کی بات ختم ہوئی۔

شیخ نے اپنے رسالہ کے متن میں یہ بتایا ہے کہ کلمہ لا اِلہ اِلا اللہ نفی اور اثبات دونوں پر قائم ہے، یعنی اللہ کے سوا ہر ایک کی عبادت کی نفی اور صرف ایک اللہ کی عبادت کا اثبات جس کی عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے جیسے اس کی ملکیت اور دوسرے افعال میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اِس کی وضاحت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے: "وإذ قال إبراهيم لأبيه وقومه إنني براء مما تعبدون" نیز اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد سے بھی ہوتی ہے: "قل يا أهل الكتاب تعالوا إلىٰ كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون"]

ممکن ہے کہ اِس سے شیخ کی مراد یہ ہو کہ انہوں نے کلمہ لا اِلہ اِلا اللہ کے بارے میں بتایا ہے کہ یہ کلمہ نفی اور اثبات پر قائم ہے۔ اب اِن دونوں آیات کے ذریعہ انہوں نے اِس کی دو دلیلیں ذکر کی ہیں۔ پہلی آیت میں "إنني براء مما تعبدون" نفی ہے اور "إلاّ الذي فطرني" اثبات ہے۔ دوسری آیت میں "اَلاّنعبد" نفی ہے اور "اِلاّاللہ" اثبات ہے۔

یہ بھی امکان ہے کہ ان کی مراد یہ ہو کہ انہوں نے شرک سے براءت کے وجوب اور مشرکین سے مکمل لاتعلقی کے بارے میں کلام کیا ہو اور اسی پر آیت سے استدلال کیا ہو۔ واللہ اعلم

مصنف رحمہ اللہ کا قول: محمد اللہ کے رسول ہیں کی شہادت دینے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "لقد جاءكم رسول من أنفسكم عزيز عليه ما عنتم حريص عليكم بالمؤمنين رءوف رحيم" (تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے اور جو تمہاری منفعت کے بہت خواہشمند رہتے ہیں ایمان والوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں)

یہ محمد اللہ کے رسول ہیں کی شہادت دینے کی دلیل ہے۔ قرآن میں اس کے اور بہت سے دلائل موجود ہیں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول: محمد اللہ کے رسول ہیں کی شہادت دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے حکم کی اطاعت و پیروی کی جائے، آپ کی دی ہوئی خبروں کی تصدیق کی جائے، آپ نے جن کاموں کی ممانعت کی ہے ان سے اجتناب کیا جائے اور آپ نے جو طریقہ مشروع کیا ہے اُسی کے مطابق اللہ کی عبادت کی جائے۔

شیخ نے محمد اللہ کے رسول ہیں کی شہادت کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے چار چیزوں کا تذکرہ کیا ہے:

۱- آپ کے حکم کی اطاعت کی جائے۔

۲- آپ کے منع کردہ کاموں سے اجتناب کیا جائے۔

۳- آپ کی دی ہوئی خبر کی تصدیق کی جائے۔

۴- اللہ کی عبادت کے معاملہ میں آپ کے بتائے ہوئے طریقہ پر اکتفا کیاء جائے اور عبادت کے معاملہ میں نئی ایجاد کردہ بدعات کو ترک کر دیا جائے۔

مذکورہ بالا چاروں امور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دینے کے منجملہ لوازمات میں سے ہیں۔ جس نے اِن میں سے کچھ کو ترک کر دیا تو اس کی شہادت میں اتنی کمی رہ گئی جتنا اس نے ترک کیا۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: ایمان کا تعلق دو اصولوں سے ہے: رسول کے حکموں کی اطاعت اور اس کی دی ہوئی خبروں کی تصدیق۔

اس کے بعد مصنف رحمہ اللہ نے نماز، زکاۃ، روزہ اور حج کے دلائل ذکر کئے ہیں۔

مسئلہ: کیا اِن ارکان میں سے کسی رکن کو پوا رانہ کرنے والا کافر ہو جائے گا؟

جواب: اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی نہ دینے والا اجماعی طور پر کافر ہے۔ نماز ترک کرنے والا بھی صحیح قول کے مطابق کافر ہے۔ اِس پر صحابہ کرام کا اجماع نقل کیا گیا ہے، لیکن علماء کا اس مقدار کے بارے

میں اختلاف ہے جسے ترک کرنے سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم صحیح یہ ہے کہ نماز کو بالکلیہ ترک کر دینے کی وجہ سے انسان کافر ہو جاتا ہے۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اور ہمارے شیخ ابن عثیمین کا یہی موقف ہے۔

زکاۃ، روزہ اور حج کو ترک کرنے والا صحیح قول کے مطابق کافر نہیں ہے، لیکن وہ بہت بڑے گناہ اور جرم کا مرتکب ضرور ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے سلامتی اور عافیت کے طالب ہیں۔[1]

ابن رجب رحمہ اللہ کہتے ہیں: عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث (بنی الإسلام علی خمس) سے مراد یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد ان پانچ چیزوں پر قائم ہے۔ یہ پانچ چیزیں اسلام کے ارکان اور اس کے ستون کی طرح ہیں۔ مقصود اسلام کو عمارت سے تشبیہ دینا ہے۔ مذکورہ پانچوں چیزیں اس عمارت کے ستون ہیں۔ ان ستونوں کے بغیر اسلام کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ اسلام کے دیگر احکام اس کی عمارت کے لئے تکملہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر ان احکام میں سے کسی حکم پر عمل نہیں ہو سکا تو اس سے اسلام کی عمارت قائم رہے گی لیکن اس میں کمی واقع ہو گی لیکن اس کمی کی وجہ سے عمارت منہدم نہیں ہو گی، البتہ ان ستونوں کا معاملہ اس کے برخلاف ہے۔ ان ستونوں کی غیر موجودگی کی وجہ سے بلاشبہ اسلام کی عمارت قائم نہیں ہو سکے گی۔ اسی طرح شہادتیں (توحید و رسالت کی گواہی) کے فقدان کی صورت میں بھی اسلام کی عمارت کا وجود نہیں ہو گا۔ رہا اسلام کا دوسرا ستون یعنی نماز قائم کرنا تو احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا تارک دائرہ اسلام سے نکل جاتا ہے۔۔۔۔۔ سلف و خلف کی ایک جماعت کا یہی قول ہے۔۔۔۔۔

علماء کی ایک جماعت کا یہ موقف ہے کہ جس نے اسلام کے پانچوں ارکان میں سے کسی ایک رکن کو جان بوجھ کر ترک کر دیا تو وہ اس کی وجہ سے کافر ہے۔

شیخ حافظ حکمی "معارج القبول" میں کہتے ہیں: ان ارکان میں سے کچھ وہ ہیں جن سے اسلام کی عمارت کی تکمیل ہوتی ہے اور ان میں سے کچھ وہ ہیں جن کے بغیر اسلام کی عمارت قائم ہی نہیں رہ سکتی ہے۔

---

1. امام احمد سے منقول ایک روایت یہ ہے کہ جس نے اسلام کے ان پانچ ارکان میں سے کسی ایک کو بھی ترک کر دیا تو کافر ہو گیا۔

دوسرا درجہ ایمان ہے۔ اس کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے اعلی "لا إلہ إلا اللہ" کہنا اور سب سے ادنی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹانا ہے اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

ایمان کے چھ ارکان ہیں: اور وہ یہ کہ آپ اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی نازل کردہ کتابوں، اس کے رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں، نیز آپ اچھی و بری دونوں طرح کی تقدیروں پر ایمان لائیں۔

ایمان کے ان چھ ارکان کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "ليس البر أن تولوا وجوهكم قبل المشرق والمغرب ولكن البر من آمن بالله واليوم الآخر والملائكة والكتاب والنبيين" (ساری اچھائی مشرق و مغرب کی طرف منہ کرنے ہی میں نہیں بلکہ حقیقتاً اچھا وہ شخص ہے جو اللہ تعالیٰ پر، قیامت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب اللہ پر اور نبیوں پر ایمان رکھنے والا ہو)

تقدیر پر ایمان لانے کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: " إنما كلّ شيء خلقناه بقدر " (بیشک ہم نے ہر چیز کو ایک (مقررہ) اندازے پر پیدا کیا ہے)

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں دین کے درجات میں سے دوسرے درجہ کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ ایمان کا درجہ ہے۔ مصنف نے اس مذکورہ متن میں ایمان کے ارکان اور تمام ارکان کی دلیل ذکر کر دی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں[1] .....] یہاں ایمان عام معنی میں استعمال ہوا ہے، اس میں اسلام بھی داخل ہے۔

ایمان دو طرح کا ہے:

1۔ عام: اس سے دین کے تینوں درجات مراد ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد: "ایمان کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں اور حیا اور ایمان کی ایک شاخ ہے"[2] میں یہی عام ایمان مراد ہے۔

1۔ جن نصوص میں ایمان کی شاخوں کا تذکرہ ہے وہ تین الفاظ کے ساتھ منقول ہیں:
(ا) ساٹھ سے زائد شاخیں۔ یہ روایت صحیح بخاری میں منقول ہے۔
(ب) ستر سے زیادہ شاخیں۔ یہ روایت صحیح مسلم وغیرہ میں منقول ہے۔
(ج) ستر سے زیادہ یا ساٹھ سے زیادہ شاخیں۔ اس روایت کو بھی امام مسلم وغیرہ نے نقل کیا ہے۔
اسی لئے اس سلسلہ میں علماء کے دو اقوال ہیں:
1۔ ایمان کی ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں، اس لئے کہ یہ سب سے کم تعداد ہے اور جہاں زیادہ تعداد بیان کی گئی ہے وہ مشکوک معاملہ ہے۔ یہ ابن حجر کا موقف ہے جیسا کہ فتح الباری میں منقول ہے۔
2۔ ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں، اسے امام نووی نے اختیار کیا ہے، اس لئے کہ اس میں ثقہ کی طرف سے اضافہ ہے لہذا اسے قبول کیا جائے گا۔

2۔ یہ صحیح بخاری میں منقول ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں اور حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔ صحیح مسلم کی ایک دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ایمان کی ستر سے زیادہ شاخیں ہیں

2۔ خاص: اس سے مراد ایمان کی چھ ارکان پر ایمان لانا ہے۔ اس کی مزید وضاحت آگے نقل کی جانے والی عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں آئے گی۔

"البضع" باء کے کسرہ کے ساتھ۔ اس کا اطلاق تین سے دس تک کے عدد پر ہوتا ہے۔

"الشعبۃ" کسی چیز کا مجموعہ یا ٹکڑا۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [ایمان کے چھ ارکان ہیں اور وہ یہ کہ آپ اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، آخرت کے دن اور اچھی وبری تقدیر پر ایمان لائیں]

1۔ اللہ پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے وجود پر ایمان لایا جائے، اس بات پر ایمان لایا جائے کہ وہ اپنی ربوبیت و الوہیت اور اپنے افعال میں یکتا و تنہا ہے، صرف وہی عبادت کے لائق ہے، اپنے اسماء وصفات میں وہ یکتا و تنہا ہے، کوئی چیز اس کے جیسی نہیں ہے، وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے، ہر قسم کی واجب و مستحب عبادات کے ذریعہ اس کے سامنے ذلت و مسکنت اختیار کیا جائے، ہر دم اسے یاد کیا جائے اور تمام کاموں میں دل کو اسی سے وابستہ کیا جائے۔

2۔ فرشتوں پر ایمان: اس میں ان کے وجود، کاموں اور اوصاف پر ایمان لانا شامل ہے۔

3۔ کتابوں پر ایمان: اس سے مراد وہ کتابیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں پر نازل کیا۔ اس میں یہ شامل ہے کہ ان کتابوں کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان لایا جائے، ان کتابوں کا جو نام ہم نے جانا ہے اسے تسلیم کیا ہے، ان میں جو صحیح باتیں منقول ہیں ان کی تصدیق کی جائے اور یہ عقیدہ رکھا جائے کہ ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے نزول کے بعد دیگر ساری آسمانی کتابیں منسوخ ہو چکی ہیں۔

یا ساٹھ سے زیادہ شاخیں ہیں، ان میں سب سے افضل لا إلہ إلا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنی تکلیف دہ چیز کو راستہ سے ہٹا دینا ہے اور حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ اسی طرح ابو داؤد اور نسائی کی روایت میں بھی "سب سے افضل" کے الفاظ آئے ہیں۔ کتب ستہ (حدیث کی مشہور چھ کتابیں) میں اس معنی کی کسی حدیث میں (أعلاھا قول: لا إلہ إلا اللہ) کے الفاظ منقول نہیں ہیں۔ سنن ترمذی، سنن ابن ماجہ اور مسند احمد میں (وأرفعھا قول: لا إلہ إلا اللہ) کے الفاظ آئے ہیں۔

4۔ رسولوں پر ایمان: اس میں یہ شامل ہے کہ ان تمام رسولوں کی رسالت برحق تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں رسالت کے لئے منتخب کیا تھا۔ جس نے ان رسولوں میں سے کسی ایک کی رسالت کا انکار کیا تو اس نے سارے رسولوں کا انکار کیا۔

تفسیر بغوی میں منقول ہے: حسن بصری سے دریافت کیا گیا: اے ابو سعید! کیا آپ نے اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات پر غور کیا "كذبت قوم نوح المرسلين" (نوح علیہ السلام کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا) "كذبت عاد المرسلين" (قوم عاد نے رسولوں کو جھٹلایا) "كذبت ثمود المرسلين" (قوم ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا) ان ساری قوموں کی طرف تو صرف ایک رسول کو مبعوث کیا گیا تھا پھر تمام رسولوں کی تکذیب کی بات کیوں کہی گئی ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جو بنیادی پیغام پہلے رسول لے کر آئے تھے وہی پیغام بعد کے تمام رسول لے کر آئے تھے۔ جب ان لوگوں نے ایک رسول کی تکذیب کی تو گویا انہوں نے تمام رسولوں کی تکذیب کی۔

نیز اس میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم نے ان رسولوں کے جو نام جانے ہیں ان پر ایمان لایا جائے، ان کی جو خبریں صحیح اور ثابت ہیں ان کی تصدیق کی جائے، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت پر عمل کیا جائے اور یہ عقیدہ رکھا جائے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام رسالتوں کو منسوخ کرنے والی ہے۔

5۔ آخرت کے دن پر ایمان: اس سے قیامت کا دن مراد ہے جس کے بعد کوئی دن نہیں ہو گا۔ اس میں یہ شامل ہے کہ آخرت کا ہر شخص کو سامنا کرنا پڑے گا، آخرت کی ہولناک صورتحال اور اس کے بڑے امور و واقعات پر ایمان لایا جائے۔

آخرت پر ایمان یہ ہے کہ حوض کوثر، حشر و نشر، حساب و کتاب، میزان اور ان کے علاوہ دیگر باتیں جو آخرت کے تعلق سے معروف ہیں ان سب پر ایمان لایا جائے۔

آخرت پر ایمان یہ ہے کہ جنت اور اس کی نعمتوں اور جہنم اور اس کے سخت عذاب پر ایمان لایا جائے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ انسان کی موت ہی سے آخرت کا دن شروع ہو جاتا ہے۔ اس میں موت کے وقت کی سختی اور قبر کے اندر آرام و راحت یا عذاب و سزا سب شامل ہے۔

6۔ اچھی اور بری تقدیر پر ایمان: اس طور پر کہ بندہ جانتا ہو اور اس کا یہ عقیدہ ہو کہ اس کائنات میں واقع ہونے والی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی لکھی ہوئی تقدیر میں پہلے سے موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ مخلوقات کی تخلیق سے پہلے ہی سے ان احوال سے واقف ہے۔ اللہ ہی نے ان ساری چیزوں کو لکھا، سب کچھ اسی کی مشیئت سے ہوتا ہے اور ہر چیز کا خالق وہی ہے۔

تقدیر پر ایمان میں یہ چار چیزیں شامل ہیں:

(أ) علم: اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اجمالی و تفصیلی طور پر جانتا ہے، اس کا یہ علم ازلی اور ابدی ہے، چاہے اس کا تعلق اس کے اپنے اعمال سے ہو یا بندوں کے افعال سے ہو۔

(ب) کتابت: اس بات پر ایمان کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو لوح محفوظ میں لکھ دیا ہے۔

علم اور کتابت کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "ألم تعلم أن الله يعلم ما في السماء والأرض إن ذلك في كتاب إن ذلك على الله يسير" (کیا آپ نے نہیں جانا کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے۔ یہ سب لکھی ہوئی کتاب میں محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ پر تو یہ امر بالکل آسان ہے)

(ج) مشیئت: اس بات پر ایمان کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیئت، ارادہ اور اس کی لکھی ہوئی تقدیر کے تحت ہو رہا ہے، چاہے وہ دنیاوی تقدیری ارادے کے تحت ہو یا شرعی ارادہ کے تحت ہو۔

(د) تخلیق: اس بات پر ایمان کہ تمام کائنات ذاتی و صفاتی طور پر اور اپنی حرکات و سکنات کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "الله خالق كل شيء" (اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے) اس تخلیق میں بندوں کے افعال بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "والله خلقكم وما تعلمون" (اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اسے بھی)

یہ رہا ایمان کے چھ ارکان کے بارے میں مختصر کلام۔ اس سے زیادہ تفصیل شرح (الواسطیۃ) میں آئے گی ان شاء اللہ۔

مسئلہ: کیا ایمان کے ارکان بھی اسلام کے ارکان کی طرح ہیں، یعنی ان میں کچھ بنیادی ارکان ہیں اور کچھ مکمل کرنے والے ارکان؟

جواب: نہیں، اگر کوئی شخص ایمان کے چھ ارکان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کر دے تو وہ کفر اکبر کا ارتکاب کرنے والا کافر ہو گا۔ العیاذ باللہ

دین کا تیسرا درجہ احسان ہے۔ اس کا صرف ایک رکن ہے یعنی آپ اللہ کی عبادت اس طرح کریں گویا آپ اسے دیکھ رہے ہیں، اگر آپ اسے نہیں دیکھ رہے ہیں تو وہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "إن الله مع الذين اتقوا والذين هم محسنون" (یقین مانو کہ اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں اور نیک کاروں کے ساتھ ہے)

دوسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وتوكل على العزيز الرحيم الذي يراك حين تقوم وتقلبك في الساجدين إنه هو السميع العليم" (اپنا پورا بھروسہ غالب مہربان اللہ پر رکھ جو تجھے دیکھتا رہتا ہے جبکہ تو کھڑا ہوتا ہے اور سجدہ کرنے والوں کے درمیان تیرا گھومنا پھرنا بھی)

تیسری دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "وما تكون في شأن وما تتلو منه من قرآن ولا تعلمون من عمل إلّا كنا عليكم شهودا إذ تفيضون فيه" (اور آپ کسی حال میں ہوں اور منجملہ ان احوال کے آپ کہیں سے قران پڑھتے ہوں اور جو کام بھی کرتے ہوں ہم کو سب کی خبر رہتی ہے جب تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو)

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے تحت دین کے تیسرے درجہ کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ احسان کا درجہ و مقام ہے۔ اس اقتباس میں احسان کی دلیل بھی ذکر کی گئی ہے۔

الاحسان لغوی اعتبار سے "الحسن" سے مشتق ہے اور اس کا مطلب ہے مہارت اور عمدگی کے ساتھ کسی کام کو کرنا، اس لئے کہ جس نے مہارت اور عمدگی کے ساتھ کوئی کام کیا اسی کے لئے عربی میں "أحسن" بولا جاتا ہے۔[1]

احسان مراقبہ اور تصور کا مقام ہے۔ اس میں عبادت کرنے والا دوران عبادت اپنے پروردگار کے سامنے ہونے کا تصور کرتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام احوال میں رب کے مشاہدہ کرنے کا تصور کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے مراقبہ اور تصور کا احساس جتنا زیادہ ہوگا احسان کا درجہ و مقام بھی اسی قدر اونچا اور بلند ہوگا اور یہ احساس جتنا کمزور ہوگا اتنا ہی مقام احسان کمزور ہوگا۔

ابن رجب فتح الباری میں رقمطراز ہیں: یہ ایمان کا سب سے اعلی درجہ ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے معاملہ میں مومنین اور محسنین ایمانی طاقت اور تصور احسان کے اعتبار سے ایک دوسرے سے متفاوت ہوتے ہیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: بندہ کو اللہ کا اتنا ہی قرب حاصل ہوتا ہے مقام احسان تک جتنی اس کی رسائی ہوتی ہے۔ اسی کے حساب سے لوگوں کی نمازوں میں بھی فرق ہوتا، یہاں تک کہ فضل و کمال کے اعتبار سے دو افراد کی نماز کے درمیان اتنا فرق ہوتا ہے جتنا زمین و آسمان کا درمیانی فاصلہ ہے جبکہ ان دونوں کا قیام، رکوع اور سجود ایک ہی جیسے ہیں۔

نووی نے شرح صحیح مسلم میں کہا ہے: (الإحسان أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك) یہ وہ جامع اور معنی خیز کلمات ہیں جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو قدرت عطا کی گئی تھی۔ اگر ہم فرض کریں کہ کوئی شخص عبادت کے لئے کھڑا ہو گیا، وہ اپنے رب کو دیکھنے کا تصور بھی قائم کئے ہوئے ہے، اس نے حتی المقدر خشوع و خضوع، عمدگی اور ظاہر و باطن ہر اعتبار سے نماز کی طرف متوجہ رہنے کی کوشش کی تاکہ اسے اچھے طریقہ سے مکمل کر سکے۔ وہ اس اہتمام پر جس حد تک قادر ہوگا اسے ضرور

---

[1] ابن حجر کے بقول: الاحسان مصدر ہے۔ أحسن یحسن إحسانا کہا جاتا ہے۔ یہ فعل بذات خود متعدی ہے اور دوسرے اسم سے مل کر بھی متعدی کے معنی دیتا ہے مثلاً أحسنتُ کے معنی ہیں میں نے کسی کام کو عمدگی کے ساتھ کیا اور أحسنت إلی فلاں کے معنی ہیں میں نے فلاں کے ساتھ احسان کا معاملہ کیا۔ یہاں پر پہلا معنی مراد ہے، اس لئے کہ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ عبادت کو عمدگی کے ساتھ انجام دیا جائے

عمل میں لائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: تم تمام احوال میں اللہ کی اس طرح عبادت کرو جیسے تم عینی مشاہدہ کی حالت میں عبادت کرتے۔ عینی مشاہدہ کی حالت میں نماز کی مکمل ادائیگی کا سبب بندہ کا یہ جاننا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے حال سے آگاہ ہے، ایسی حالت میں بندہ کسی کوتاہی کی طرف قدم نہیں بڑھاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اس کے حال پر مطلع ہونے کا تصور اس کے ذہن میں قائم ہوتا ہے۔ رب کو کھلی آنکھوں سے نہ دیکھ پانے کے باوجود یہ کیفیت پائی جاتی ہے، لہذا اس صورت حال کے تقاضہ کے مطابق اسے عمل کرنا چاہئے۔ ان تمام باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بندوں کو عبادت میں اخلاص پیدا کرنے پر آمادہ کیا جائے اور ان کے اندر یہ تصور مستحکم کیا جائے کہ عبادت کی حالت میں وہ اپنے رب کو دیکھنے کی حالت میں ہوتے ہیں تاکہ وہ مکمل خشوع وخضوع کے ساتھ اپنی عبادت کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔

یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ مقام احسان دین کا سب سے اعلی مقام ہے، اس کے بر خلاف کچھ اہل تصوف چند ایسے مقامات کا تذکرہ کرتے ہیں جو اللہ کی قربت کے مقابلہ میں بدعت سے زیادہ قریب ہیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: مقام احسان یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت اس تصور کے ساتھ کریں گویا آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ دنیا میں بندہ کے لئے اس سے اعلیٰ دیکھنے کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی ہے۔ بہت سے صوفیاء کہتے ہیں کہ اس سے اوپر بھی ایک مقام ہے اور وہ ہے حق کو دیکھنا اور اس کے ماسوا کو ذہن ودماغ سے دور کر دینا۔ یہ مقام فنا ہے۔

ان کا یہ بھی قول ہے: اگر مقام احسان سے اوپر کوئی مقام ہوتا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل سے اس کا تذکرہ کیا ہوتا اور جبریل نے اس کے بارے میں دریافت کیا ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے سارے مقامات کو اسلام، ایمان اور احسان کی شکل میں جمع کر دیا ہے۔

ان کا یہ بھی قول ہے: آپ یہ اعتقاد نہ رکھیں کہ دین پر چلنے والے کے لئے مقام احسان سے اعلیٰ بھی کوئی مقام ہے۔

یہ احسان بہت اونچا مقام ہے۔ مجاہدہ اور ذکر الہی کی کثرت کے ذریعہ ہی اس مقام تک رسائی ممکن ہے۔ ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: ذکر الہی سے غافل انسان مقام احسان کو حاصل نہیں کر سکتا ہے جیسے کہ ایک جگہ بیٹھا ہوا انسان بیت اللہ نہیں پہنچ سکتا ہے۔

مسئلہ: علماء کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی جو تعریف کی ہے اس کے دو درجے ہیں:

1۔ درجۂ استحضار (یعنی مشاہدہ) آپ عبادت کرتے وقت یہ تصور کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہیں گویا کہ آپ اس کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔

2۔ درجہ اطلاع (یعنی مراقبہ) آپ کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام حرکات وسکنات سے آگاہ ہے اور آپ اس کی نگرانی میں ہیں۔ اس سے عبادت کو بطریق احسن انجام دینے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔

ان دونوں درجات میں پہلا درجہ مشاہدہ کا ہے جس میں آپ یہ تصور کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں اور دوسرا درجہ مراقبہ کا ہے، اس میں یہ بات آپ کے ذہن میں ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو دیکھ رہا ہے۔

علماء پہلے درجہ کو مقام طلب وشوق کہتے ہیں اور دوسرے درجہ کو مقام گھبراہٹ وخوف کہتے ہیں۔ اسی لئے وہ پہلے مقام کو دوسرے مقام سے افضل قرار دیتے ہیں۔

ابن رجب فتح الباری میں لکھتے ہیں: یہ دو مقام ہیں؛ ایک مقام مراقبہ ہے جس میں بندہ اللہ سے قریب ہونے کا استحضار کرتا ہے اور یہ تصور کرتا ہے کہ اللہ اس کے حال سے آگاہ ہے۔ وہ یہ تصور کرتا ہے کہ وہ ہر وقت اللہ کے سامنے ہے اور وہ اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہا ہے، اس کے باطنی وظاہری کاموں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ یہ مراقبہ کرنے والے مخلصین کا مقام ہے۔ یہ احسان کا سب سے کمتر مقام ہے۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ بندہ اپنے دل سے اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اس کی حالت ایسی ہو جاتی ہے گویا وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ یہ احسان کا سب سے اونچا مقام ہے۔ یہ عارفین کا مقام ہے۔

سلف میں سے کسی کا قول ہے: جس نے اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہوئے عمل کیا وہ عارف ہے اور جس نے اس تصور کے ساتھ عمل کیا کہ اللہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہے تو وہ مخلص ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ کے بقول: عبادت میں احسان یہ ہے کہ اس میں اخلاص، خشوع، اشتباہ کے وقت فارغ البالی اور معبود کے مراقبہ کا تصور حاصل ہو۔ انہوں نے الجواب میں احسان کی دو حالتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان میں بلند ترین حالت یہ ہے

کہ دل کے ذریعہ مشاہدۂ حق کا بندہ پر غلبہ ہو جائے اور محسوس ہو کہ وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ حدیث کے الفاظ (کانک تراہ) کا یہی مطلب ہے یعنی گویا آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ دوسری حالت یہ ہے کہ یہ استحضار ہو کہ حق اس کی تمام حرکات وسکنات سے آگاہ ہے، وہ جو کچھ کرتا ہے اسے دیکھ رہا ہے۔ حدیث کے الفاظ (فإنه يراك) کا یہی مطلب ہے۔

ہمارے شیخ ابن عثیمین کہتے ہیں: یہاں دو درجے ہیں؛ پہلا درجہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت اس طرح کریں گویا آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ یہ طالب کا درجہ ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت اس احساس کے ساتھ کریں کہ وہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ یہ خوف وگھبراہٹ کا درجہ ہے۔ یہ دونوں اونچے درجے اور مقامات ہیں، لیکن ان میں پہلا مقام اکمل وافضل ہے۔ شیخ ابن عثیمین کی بات ختم ہوئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی جو تعریف کی ہے اس پر غور کرنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ احسان کا ایک ہی مقام ہے اور وہ یہ ہے کہ بندہ عبادت کرتے وقت یہ تصور کرے وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ اس سے خضوع، خشوع، حضور قلب اور عبادت میں عمدگی پیدا ہوتی ہے۔

رہے حدیث کے یہ الفاظ (فإنه لم تكن تراه فإنه يراك) تو یہ اس مقام تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ واللہ اعلم۔ آپ نووی کے کلام پر بھی غور کیجئے جسے اوپر نقل کیا گیا ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں نووی کا یہ قول نقل کیا ہے: حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم اللہ کو دیکھنے کا تصور قائم نہیں کر پاتے ہو تب بھی اپنی عبادت کو عمدگی کے ساتھ انجام دیتے رہو اس لئے کہ اللہ تو تم کو ہر حال میں دیکھ رہا ہے۔

ہم احسان کے دو درجے تسلیم کریں یا اس کا ایک درجہ تسلیم کریں، دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ جن لوگوں نے احسان کے دو درجے تسلیم کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ جس نے ان دو درجات میں سے کسی ایک کو پالیا وہ محسن ہے۔ جو لوگ اس کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ انسان احسان کے ادنی درجہ سے اعلیٰ درجہ تک پہنچتا ہے۔ جو لوگ احسان کا صرف ایک درجہ تسلیم کرتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ احسان یہ ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کریں گویا آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو آپ محسن ہیں ورنہ نہیں۔ اس مقام تک پہنچنے کا وسیلہ یہ ہے کہ آپ اپنی عبادت کے وقت یہ تصور قائم کریں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی حالت سے آگاہ ہے اور وہ آپ کو دیکھ رہا ہے۔ اگر مستقل طور پر اس تصور کے ساتھ آپ

عبادت کرتے رہے تو ہو سکتا ہے کہ آپ احسان کے مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں جس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ اللہ کی عبادت اس طرح کریں گویا آپ اسے دیکھ رہے ہیں۔ واللہ اعلم

سنت سے اس کی دلیل حدیث جبریل سے مشہور عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ہم لوگ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، اچانک ایک شخص ہمارے سامنے ظاہر ہوا، اس کے کپڑے نہایت سفید اور اس کے بال نہایت سیاہ تھے۔ اس کے اوپر سفر کے اثرات بھی ظاہر نہیں ہو رہے تھے، ہم میں سے کوئی شخص اسے جانتا بھی نہیں تھا۔ وہ شخص آکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ گیا، اپنے گھٹنے کو آپ کے گھٹنے سے ملا دیا اور اپنی ہتھیلیوں کو آپ کے زانو پر رکھ دیا اور دریافت کیا: اے محمد! مجھے اسلام کے بارے میں بتایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ تم شہادت دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں، تم نماز قائم کرو، زکاۃ ادا کرو، رمضان کے روزے رکھو اور استطاعت ہو تو بیت اللہ کا حج کرو۔

اس اجنبی نے کہا: آپ نے سچ کہا۔ ہم لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ شخص سوال بھی کرتا ہے اور تصدیق بھی کرتا ہے۔

اس نے پھر دریافت کیا: آپ مجھے ایمان کے بارے میں بتایئے؟ آپ نے فرمایا: ایمان یہ ہے کہ تم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں، آخرت کے دن اور اچھی و بری تقدیر پر ایمان لاؤ۔

اس اجنبی نے کہا: آپ نے سچ کہا۔

پھر اس نے دریافت کیا: آپ مجھے احسان کے بارے میں بتایئے؟ آپ نے فرمایا: تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس اجنبی نے دریافت کیا: آپ مجھے قیامت کے بارے میں بتایئے؟ آپ نے فرمایا: قیامت کے بارے میں جس سے دریافت کیا گیا ہے اسے دریافت کرنے والے سے زیادہ علم نہیں ہے۔

اس اجنبی نے کہا: آپ مجھے قیامت کی نشانیوں کے بارے میں بتایئے؟ آپ نے فرمایا: قیامت کی نشانی یہ ہے کہ لونڈی اپنی مالکن کو جنم دے گی اور تم ننگے پاؤں اور ننگے بدن رہنے والوں، محتاجوں اور بکریوں کے چرواہوں کو دیکھو گے وہ عمارت تعمیر کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت کرنے کی کوشش کریں گے۔

عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: اس کے بعد وہ اجنبی چلا گیا، میں کچھ دیر اسی حال میں رہا پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے دریافت فرمایا: اے عمر! جانتے ہو سوال کرنے والا کون تھا؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اس کے رسول ہی کو اس کا زیادہ علم ہے۔ آپ نے فرمایا: وہ جبریل تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لئے آئے تھے۔ (صحیح مسلم)

مصنف رحمہ اللہ نے دین کے تینوں درجات کی دلیل کے طور پر طویل حدیث جبریل کو نقل کیا ہے۔

ابن رجب کہتے ہیں: یہ بہت عظیم الشان حدیث ہے۔ یہ حدیث پورے دین کی تشریح کرنے والی ہے۔ اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے آخر میں ارشاد فرمایا: یہ جبریل تھے، تمہیں تمہارا دین سکھانے کے لئے تمہارے پاس آئے تھے۔

ابن دقیق العید کہتے ہیں: یہ عظیم الشان حدیث ہے۔ اس میں تمام ظاہری و باطنی اعمال کا بیان ہے۔ یہ حدیث سارے علوم شریعت کا مرجع ہے، کیونکہ اس میں سنت کا علم جمع ہو گیا ہے۔ یہ حدیث سنت کے لئے ماں (اساس) کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس عظیم الشان حدیث کے تعلق سے مفصل کلام امام نووی کی "الأربعین" کی شرح میں آئے گا، ان شاء اللہ۔

اصل ثانی کا خلاصہ: اس اصل کے تحت دین کی اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے جس کا اللہ نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے یعنی تنہا اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنا، رسولوں کے لائے ہوئے احکامات کی مکمل پیروی، اہل ایمان سے محبت، کافروں سے دشمنی۔ نیز اس اصل کے تحت دین کے تین درجات کو بیان کیا گیا ہے اور وہ ہیں: اسلام، ایمان اور احسان۔ ان میں سب سے اعلیٰ مقام احسان ہے، اس کے بعد ایمان کا درجہ ہے جس کے چھ ارکان ہیں، پھر اسلام کا درجہ ہے جس کے پانچ ارکان ہیں۔

تیسری اصل: یہ ہے کہ تم اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جانو اور انہیں پہچانو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام و نسب محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم ہے۔ ہاشم کا تعلق قبیلۂ قریش سے تھا۔ قریش عرب تھے اور عرب اسماعیل بن ابراہیم خلیل اللہ علیہما السلام کی اولاد میں سے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترسٹھ (63) سال کی عمر پائی۔ چالیس سال نبوت ملنے سے پہلے اور تیئس (23) سال نبی ورسول بنائے جانے کے بعد۔

اِقرأ (سورہ علق کی ابتدائی آیات) کے ذریعہ آپ کو نبوت عطا کی گئی اور سورہ المدثر کی ابتدائی آیات کے ذریعہ آپ کو رسالت سے سرفراز کیا گیا۔

آپ کا شہر مکہ تھا بعد میں آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔

اللہ تعالیٰ نے شرک سے لوگوں کو ڈرانے و خبر دار کرنے اور توحید کی دعوت دینے کے لئے آپ کو مبعوث کیا تھا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "يا إيها المدثر قم فأنذر وربك فكبّر وثيابك فطهّر والرجز فاهجر ولا تمنن تستكثر ولربك فاصبر" (اے کپڑا اوڑھنے والے کھڑا ہو جا اور آگاہ کر دے اور اپنے رب ہی کی بڑائیاں بیان کر، اپنے کپڑوں کو پاک رکھا کر، ناپاکی کو چھوڑ دے اور احسان کر کے زیادہ لینے کی خواہش نہ کر اور اپنے رب کی راہ میں صبر کر)

(قم فأنذر) کا مطلب ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شرک کے گناہ سے لوگوں کو ڈراتے تھے اور توحید کی طرف بلاتے تھے۔

(وربك فكبّر) کا مطلب ہے کہ آپ توحید کے ذریعہ اپنے رب کی عظمت کا اظہار کیجئے۔

(وثيابك فطهر) کا مطلب ہے کہ اپنے اعمال کو شرک کی آلائش سے پاک رکھئے۔

(والرجز فاهجر) رجز بتوں کو کہتے ہیں اور ھجر کے معنی ہیں ترک کرنا اور ان بتوں اور ان کے پجاریوں سے اظہار براءت کرنا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اِس حکم الٰہی کے مطابق دس سال تک توحید کی طرف لوگوں کو بلاتے رہے۔ دس سال کی مسلسل دعوت کے بعد آپ کو آسمان پر لے جایا گیا اور معراج کے اس سفر میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی گئیں۔ آپ نے تین سال تک مکہ میں رہ کر اِن نمازوں کو ادا کیا، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔

اِس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف رحمہ اللہ نے اِس میں تیسری اصل کو بیان کیا ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جاننا اور پہچاننا۔ نیز انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ زادالمعاد میں رقمطراز ہیں: بندوں کی اہم ضرورتوں میں سب سے مقدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں جاننا، آپ کی لائی ہوئی شریعت کے بارے میں جاننا، آپ نے جو خبر دی ہے اس کی تصدیق کرنا اور آپ کے حکموں کی تعمیل کرنا ہے۔ اس لئے کہ رسولوں کی اطاعت کے بغیر دنیا و آخرت کی سعادت و کامرانی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے اپنے متن میں جو کچھ ذکر کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے اہم پہلوؤں کا علم ہونا ضروری ہے۔ مصنف کے اقتباس کی روشنی میں اِس میں یہ باتیں شامل ہیں: آپ کے نام و نسب اور عمر کو جاننا۔ اِس بات کا علم کہ کس سورہ کے نزول کے ذریعہ آپ کو نبوت حاصل ہوئی اور کس سورہ کے نزول کے ذریعہ آپ رسالت سے سرفراز کئے گئے، آپ کے شہر کے بارے میں جاننا جو آپ کا وطن اصلی تھا، اس شہر کے بارے میں جاننا جہاں آپ نے ہجرت کی، آپ کی رسالت کے بنیادی پیغام کو جاننا اور رسالت ملنے کے بعد آپ کے حالات زندگی کو اجمالی طور پر جاننا۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [آپ کا نام و نسب محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم ہے]

مصنف رحمہ اللہ نے اِسی قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام و نسب ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مکمل نام و نسب یہ ہے: محمد بن عبد اللہ بن عبد المطلب بن ہاشم بن عبد مناف، بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لؤی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

امام بخاری نے اِسی قدر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب نامہ نقل کیا ہے۔ اس پر علماء کا اجماع ہے۔ عدنان کے بعد ناموں کے بارے میں اختلاف ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: عدنان تک آپ کے نسب نامہ کی صحت معلوم ہے، اِس پر ماہرین انساب کا اتفاق ہے، اِس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن عدنان کے اوپر کے ناموں کے بارے میں اختلاف ہے۔ ماہرین انساب کا اِس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے کہ عدنان اسماعیل کی اولاد میں سے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور نام محمد اور احمد ہیں۔

ابن حجر کہتے ہیں: آپ کا سب سے مشہور نام محمد ہے۔ قرآن مجید میں یہ نام کئی بار آیا ہے۔ قرآن میں آپ کا نام احمد عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی نقل کیا گیا ہے۔

قاضی عیاض کا قول ہے: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم محمد کہلانے سے پہلے احمد تھے جیسا کہ اِس کے شواہد موجود ہیں۔ اس لئے کہ آپ کا نام احمد قرآن سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں آیا ہے اور قرآن عظیم میں آپ کو محمد کے نام سے موسوم

کیا گیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے لوگوں کی حمد وثناء سے پہلے اپنے رب کی حمد بیان کی۔ اِسی طرح آپ آخرت میں رب کی حمد بیان کریں گے تو رب تعالیٰ آپ کی شفاعت قبول کرے گا تب لوگ آپ کی تعریف کریں گے۔

محمد کا معنی: یعنی وہ انسان جس کے اندر بہت سی اچھی عادتیں اور خصلتیں ہوں جن کی وجہ سے وہ تعریف وتوصیف کا مستحق ہو۔ اِس اعتبار سے آپ کا یہ نام نیک فال کے قبیل سے ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: آپ کے اندر بہت سی عمدہ صفات ہونے کی وجہ سے آپ محمد ہیں اور دوسرے لوگوں کی صفات پر آپ کی صفات کو شرف وفضیلت حاصل ہونے کی وجہ سے آپ احمد ہیں۔

اِن دوناموں کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اور نام بھی ہیں۔ امام بخاری نے اِس سلسلہ میں یہ باب قائم کیا ہے: باب ماجاء في أسماء رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں کے بارے میں جو کچھ وارد ہے ان کا بیان) پھر انہوں نے جبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "میرے پانچ نام ہیں؛ میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں ماحی ہوں جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کفر کو مٹائے گا، میں حاشر ہوں، لوگ میرے قدموں کے پاس میدان حشر میں جمع ہوں گے اور میں عاقب ہوں۔" (متفق علیہ)

عاقب کے معنی ہیں وہ نبی جس کے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ آپ سب نبیوں اور رسولوں کے بعد سب سے آخر میں رسالت سے سرفراز ہونے والے آخری رسول ہیں۔

ابو عبید کا قول ہے: میں نے سفیان بن عیینہ سے عاقب کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے کہا: اِس کا مطلب ہے سب سے آخری نبی۔ اِسی طرح ہر چیز جو دوسری چیز کے بعد ہو وہ عاقب ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ کا قول ہے: اِس حدیث کا ظاہری مطلب یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتایا ہے کہ میرے یہ پانچ نام ہیں جن کے ساتھ مجھے خاص کیا گیا ہے۔ مجھ سے پہلے کسی کو اِن ناموں سے موسوم نہیں کیا گیا یا یہ کہ یہ نام عظمت والے ہیں یا یہ نام پچھلی قوموں میں مشہور رہے ہیں۔ آپ نے اِن پانچ ناموں کو بطور حصر ذکر نہیں کیا ہے۔

قاضی عیاض کا قول ہے: اللہ تعالیٰ نے اِن ناموں کی اِس سے حفاظت فرمائی کہ آپ سے پہلے کسی کو اِن ناموں سے موسوم کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے کچھ عرصہ پہلے عرب قبائل میں پیدا ہونے والے کچھ بچوں کا نام محمد

رکھا گیا کیوں کہ ان لوگوں نے کاہنوں اور عیسائی عالموں سے سنا تھا کہ آنے والے دور میں ایک نبی کی بعثت ہو گی جس کا نام محمد ہو گا، لہذا اِس امید میں کہ وہ نبی ان کی اولاد میں سے ہو کچھ لوگوں نے اپنے بیٹوں کے نام محمد رکھ دیئے۔ یہ کل چھ لوگ تھے جو آپ کی ولادت سے قبل اِس نام سے موسوم کئے گئے، کوئی ساتواں نہیں تھا۔

ابن حجر کہتے ہیں: میں نے ایک علاحدہ جزء میں ان لوگوں کے بارے میں معلومات جمع کیں جنہیں آپ کی ولادت سے قبل محمد کے نام سے موسوم کیا گیا تھا تو ان کی تعداد بیس تک پہنچی، لیکن ان میں سے کچھ کے ناموں میں وہم تھا۔ اخیر میں اِس طرح کے کل پندرہ نام باقی رہ گئے۔ ابن حجر کی بات ختم ہوئی۔ اس کے بعد ابن حجر رحمہ اللہ نے ان ناموں کو شمار کیا ہے۔

ابن حجر رحمہ اللہ کہتے ہیں: کچھ اہل علم نے کہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسماء اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کی طرح ننانوے ہیں۔ انہوں نے مزید کہا ہے کہ اگر ہوئی تلاش و جستجو کرنے والا کوشش کرے تو یہ تعداد تین سو تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کے بعد ابن حجر نے بطور تعقیب کہا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیشتر اسماء جنہیں ذکر کیا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف ہیں۔ اِن میں سے بیشتر اسماء بطور نام وارد نہیں ہوئے ہیں۔ وہ مزید کہتے ہیں کہ ابن العربی نے سنن ترمذی کی شرح میں کچھ صوفیاء کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار نام ہیں اور اس کے رسول کے بھی ایک ہزار نام ہیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر صفت سے ایک نام اخذ کیا جائے تو آپ کے اسماء کی تعداد دو سو سے تجاوز کر جائے گی مثلاً صادق، مصدوق، رؤف رحیم وغیرہ۔ اِسی وجہ سے کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ایک ہزار نام ہیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی ایک ہزار نام ہیں۔ یہ بات ابو الخطاب بن دحیہ نے کہی ہے، ان کی مراد آپ کے اوصاف سے ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب زاد المعاد میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں کے معانی کی تشریح کے لئے ایک فصل قائم کی ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول: ہاشم کا تعلق قریش سے تھا، قریش عرب ہیں اور عرب اسماعیل بن ابراہیم خلیل کی اولاد میں سے ہیں علیہ و علی نبینا أفضل الصلاۃ والسلام

یہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیئت سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین کے لوگوں میں سب سے اعلیٰ نسب کے حامل تھے اور سب سے زیادہ پاکیزہ نسل سے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قوم، قبیلہ اور قبیلہ کی شاخ کے اعتبار سے سب سے زیادہ معزز تھے۔ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت رہی ہے کہ انبیاء کرام اپنی قوم میں اعلی حسب و نسب کے مالک ہوتے ہیں جیسا کہ ہرقل نے کہا تھا کہ رسل اپنی قوم کے حسب و نسب میں مبعوث ہوتے ہیں۔ (متفق علیہ)

صحیح بخاری میں بھی اِسی معنی کی روایت منقول ہے کہ یہی حال رسولوں کا ہے جو اپنی قوم کے حسب و نسب میں مبعوث ہوتے ہیں یعنی خاندانی اور نسبی طور پر قوم ہی کے ایک فرد ہوتے ہیں۔

ابن حجر فتح الباری میں رقمطراز ہیں: ظاہر یہی ہے کہ ہرقل کا اِس طرح یقینی طور پر رسولوں کے حسب و نسب کے بارے میں خبر دینا سابقہ آسمانی کتابوں میں موجود علم کی بنیاد پر تھا۔

اِسی سلسلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اللہ تعالیٰ نے اسماعیل کی اولاد میں سے کنانہ کو چنا اور کنانہ سے قریش کو چنا، قریش سے بنو ہاشم کو چنا اور بنو ہاشم سے مجھے نبوت کے لئے چنا۔" (صحیح مسلم)

بنو ہاشم عرب قبائل میں نسب کے اعتبار سے سب سے افضل تھے۔ امام بخاری نے "باب: مناقب قریش" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے اور اس باب کے تحت چند احادیث نقل کی ہیں جو ان کی فضیلت پر دلالت کرتی ہیں۔

ابن حجر رحمہ اللہ نے اِس سلسلہ میں چند اقوال نقل کئے ہیں کہ قریش کس کا نام تھا اور سب سے پہلے کسے اِس نام سے موسوم کیا گیا۔ دیکھئے: فتح الباری (٦/ ٧١٦)

قریش عرب مستعربہ سے ہیں۔ نسب کے ماہرین کے نزدیک عربوں کی دو قسمیں ہیں:

١۔ عرب عاربہ: یہ اصل عرب ہیں۔ ان کا تعلق قحطان سے ہے۔ ان لوگوں نے یمن میں سکونت اختیار کی تھی، پھر وہاں سے اِدھر اُدھر منتشر ہوئے۔

٢۔ عرب مستعربہ: اِن کا تعلق عدنان سے ہے جن کا نسب اسماعیل علیہ السلام سے جاکر مل جاتا ہے۔ یہ لوگ اصل عرب نہیں تھے، اس لئے کہ اسماعیل علیہ السلام اصلاً عربوں میں سے نہیں تھے۔ لیکن جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کے مشہور واقعہ میں آیا ہے کہ جب وہ اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام کو ان کی والدہ ہاجرہ کے ساتھ بیت اللہ کے پاس چھوڑ کر رخصت

ہو گئے تو ان کے پاس قبیلہ جرہم آکر آباد ہوا۔ یہ اصل عربوں کا ایک قبیلہ تھا۔ اسماعیل علیہ السلام نے ان ہی لوگوں سے عربی سیکھی اور ان میں نمایاں حیثیت کے حامل ہوئے۔

اسی بنیاد پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسماعیل علیہ السلام سے پہلے کے عرب عرب عاربہ تھے اور اسماعیل علیہ السلام کے بعد کے عرب عرب مستعربہ کہلائے۔ عربوں کے اکثر قبائل کا تعلق اسی جنس سے ہے۔[1]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماموؤں کا تعلق بنو زہرہ سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آمنہ بنت وہب بنو زہرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترسٹھ (63) سال کی عمر پائی، چالیس سال نبوت ملنے سے قبل اور تیئس (23) سال نبی ورسول بنائے جانے کے بعد]

---

1. ابن تیمیہ رحمہ اللہ الجواب الصحیح میں کہتے ہیں: لوگوں کا اس پر اتفاق ہے کہ عدنان اسماعیل کی اولاد میں سے ہیں اور ربیعہ و مضر بھی ان ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ قحطان کے بارے میں کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ وہ بھی اسماعیل کی اولاد میں سے ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ قحطان ابراہیم علیہ السلام سے پہلے سرزمین یمن میں موجود تھے۔ ان ہی میں سے ایک قبیلہ جرہم تھا جو مکہ آکر آباد ہوا اور ان ہی سے اسماعیل علیہ السلام نے عربی زبان سیکھی۔

انہوں نے مجموع الفتاوی میں لکھا ہے: اکثر لوگوں کا خیال ہے قحطان ہود علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے نہیں تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ وہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے، اس کی دلیل حدیث اسلم ہے جنہوں نے کہا تھا کہ تم لوگ تیر اندازی کرو، تمہارے آباؤ اجداد تیر انداز تھے۔ اسلم کا تعلق قبیلہ خزاعہ سے ہے اور خزاعہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

ابن کثیر نے قصص الانبیاء میں لکھا ہے: کہا جاتا ہے کہ ہود علیہ السلام نے سب سے پہلے عربی زبان میں کلام کیا۔ وہب بن عتبہ کہتے ہیں کہ ہود علیہ السلام کے والد نے سب سے پہلے عربی میں بات کی۔ دوسرے لوگوں کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے نوح علیہ السلام نے عربی میں بات کی۔ ایک قول یہ ہے کہ سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے عربی میں بات چیت کی۔ یہی قول صحت سے زیادہ قریب ہے۔ ان کے علاوہ بھی اقوال ہیں۔ ابن کثیر کا یہ قول بھی ہے کہ اسماعیل علیہ السلام سے پہلے کے عربوں کو عرب عاربہ کہا جاتا ہے۔ ان کے بہت سے قبائل تھے، ان ہی میں سے عاد، ثمود جرہم اور قحطان بھی ہیں۔ عرب مستعربہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسماعیل علیہ السلام نے سب سے پہلے فصیح وبلیغ عربی زبان میں کلام کیا۔ انہوں نے قبیلہ جرہم سے کلام عرب کو اخذ کیا تھا۔

اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ وفات کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر ترسٹھ (63) سال تھی۔ صحیحین میں منقول عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں یہی مذکور ہے۔ نیز صحیح مسلم میں منقول انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی یہی بات کہی گئی ہے۔

ابن حجر نے فتح الباری میں کہا ہے کہ اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مکمل کی گئی۔ جب آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت آپ کی عمر ترسٹھ (63) سال تھی۔ واللہ اعلم

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر کے دو ادوار ہیں:

(أ) نبوت سے قبل آپ کی عمر چالیس سال ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: چالیس سال مکمل ہونے پر اللہ نے آپ کو مبعوث کیا۔ یہ کمال کو پہنچنے کی عمر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اسی عمر میں رسولوں کو مبعوث کیا جاتا ہے۔

(ب) نبوت ورسالت کے بعد آپ کی عمر تیئس (23) سال ہے۔

صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ چالیس سال کی عمر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اس کے بعد آپ مکہ میں تیرہ سال مقیم رہے اور آپ پر وحی الہی کا نزول ہوتا رہا۔ اس کے بعد آپ کو ہجرت کرنے کا حکم ملا جہاں آپ نے دس سال کا عرصہ گزارا۔ انتقال کے وقت آپ کی عمر ترسٹھ (63) سال تھی۔

صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ چالیس سال کی عمر میں آپ پر وحی کا نزول ہوا۔

رہا صحیح بخاری میں انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول کہ نبوت ملنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دس سال مکہ میں اور دس سال مدینہ میں رہے تو اسے کسر کے الغاء پر محمول کیا گیا ہے جو عربوں کے یہاں مشہور ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعثت کے بعد باقی عمر دو شہروں میں گزاری:

(أ) آپ مکہ میں تیرہ سال تک رہے۔ تین سال تک خفیہ دعوت دیتے رہے اور دس سال تک اعلانیہ دعوت دی اور مخالفین کی اذیتوں کا سامنا کیا۔

(ب) آپ دس سال تک مدینہ میں رہے۔

صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چالیس کی عمر میں مبعوث کیا گیا۔ نبوت ملنے کے بعد تیرہ سال تک آپ مکہ میں مقیم رہے، اس عرصہ میں آپ پر وحی نازل ہوتی رہی۔ پھر آپ کو مکہ سے ہجرت کر جانے کا حکم ملا جہاں آپ نے دس سال کا عرصہ گزارا۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ترسٹھ (63) سال تھی۔

نووی رحمہ اللہ کا قول ہے: اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ آپ ہجرت کے بعد مدینہ میں دس سال مقیم رہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اقرا (سورۂ علق کی ابتدائی آیات) کے ذریعہ آپ کو نبوت عطا کی گئی اور سورہ مدثر کی ابتدائی آیات کے ذریعہ آپ کو رسالت سے سرفراز کیا گیا]

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے بطور وحی جس چیز سے سابقہ پیش آیا وہ نیند کی حالت میں خواب تھے۔ (بخاری کی ایک دوسری روایت میں الصالحۃ یعنی نیک خواب کے الفاظ آئے ہیں۔) آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو بھی خواب دیکھتے وہ روشن صبح کی طرح سچ ثابت ہوتا، پھر خلوت میں رہنے کی محبت آپ کے دل میں ڈال دی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حراء میں خلوت نشینی کے اوقات بسر کرتے تھے، وہاں گھر آنے سے پہلے لگاتار کئی کئی راتیں عبادت میں مشغول رہتے۔ اس کے لئے آپ زاد راہ لے جایا کرتے تھے۔ پھر آپ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس آتے تو وہ پہلے کی طرح زاد راہ تیار کر دیتی تھیں۔ ایک دن جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حراء میں تھے تو پیغام حق آپ کے پاس پہنچا۔ فرشتہ آپ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ پڑھئے۔۔۔۔ (متفق علیہ) [1]

---

[1] ابن قیم رحمہ اللہ کا قول ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نبوت کا پہلا مرحلہ نیند کی حالت میں خواب دیکھنا تھا۔ آپ جو بھی خواب دیکھتے وہ روشن صبح کی طرح سچ ثابت ہوتا۔ ایک قول کے مطابق چھ ماہ تک یہی صورت حال رہی۔ نبوت کی مدت تیئس (۲۳) سال ہے۔ نبوت کے ابتدائی مرحلہ کے یہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔ واللہ اعلم

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے قرآن پاک کا جو حصہ نازل ہوا وہ سورہ العلق کی ابتدائی آیات تھیں یعنی (اقرأ باسم ربک الذي خلق) ان آیات کے نزول کے ساتھ آپ نبوت سے سرفراز ہوگئے۔ اس عرصہ میں قرآن مجید کا جو حصہ نازل ہوا اس میں تبلیغ دین کا حکم نہیں تھا۔

پھر ایک مدت تک وحی کے نزول کا سلسلہ منقطع رہا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورہ مدثر کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ اِن آیات کے نزول کے ساتھ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسالت سے سرفراز ہوگئے۔ اس مرحلہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغ دین کا حکم دیا گیا۔

صحیحین میں جابر رضی اللہ عنہ کی روایت میں منقول ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے غار حراء میں خلوت نشینی اختیار کی۔ کچھ وقت گزارنے کے بعد غار سے نیچے آیا اور وادی کے بیچ میں پہنچا تو مجھے آواز دی گئی۔ میں نے اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا۔ وہ (فرشتہ) زمین و آسمان کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں خدیجہ کے پاس آیا اور کہا: مجھے کپڑے اوڑھادو، مجھ پر ٹھنڈا پانی ڈال دو۔ اسی مرحلہ میں مجھ پر قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں (یا أیھا المدثر، قم فأنذر، وربک فکبر)

صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: میں نے ایک ماہ غار حراء میں خلوت نشینی اختیار کی۔ اس مدت کے مکمل ہونے کے بعد میں غار سے نیچے آیا۔ جب میں وادی کے بیچ میں پہنچا تو مجھے آواز دی گئی، میں نے اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھا تو مجھے کوئی بھی نظر نہیں آیا۔ دوبارہ مجھے آواز دی گئی، میں نے چاروں طرف دیکھا تو کوئی نہیں تھا، پھر تیسری بار آواز دی گئی تو میں نے سر کو اوپر اٹھایا تو وہ (جبرئیل علیہ السلام) ہوا میں عرش پر موجود تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میں شدت کے ساتھ کانپنے لگا۔ میں خدیجہ کے پاس واپس پہنچا اور کہا کہ مجھے کمبل اوڑھادو، مجھے کمبل اوڑھادو۔ ان لوگوں نے میرے اوپر پانی ڈال دیا۔ اس موقع سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی یہ آیات نازل کیں: (یا أیھا المدثر، قم فأنذر، وربک فکبر وثیابک فطھر)

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے چالیس سال مکمل ہونے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے سورہ علق کی ابتدائی آیات (اقرا باسم ربک) نازل ہوئیں۔ اس نزول قرآن کے بعد آپ نبوت سے سرفراز ہوگئے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ پر سورہ مدثر کی ابتدائی آیات (یا أیھا المدثر) نازل کیں، تب آپ رسالت سے سرفراز ہوگئے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلی وحی یہ نازل کی کہ آپ اپنے رب کے نام سے پڑھئے جس نے آپ کو پیدا کیا ہے۔ یہ آپ کی نبوت کا آغاز تھا۔ اس مرحلہ میں آپ کو صرف اپنے دل میں پڑھنے کا حکم دیا گیا، اس پیغام الٰہی کو دوسروں تک پہنچانے کا حکم نہیں دیا گیا۔ اس کے بعد آپ پر سورہ مدثر کی ابتدائی آیات (یا أیھا المدثر، قم فأنذر) نازل ہوئیں۔ اللہ تعالیٰ نے (اقرأ) کے ذریعہ آپ کو نبی بنایا اور (یا أیھا المدثر) کے ذریعہ رسالت عطا کی۔ اس کے بعد آپ کو حکم دیا گیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو اس پیغام الٰہی سے باخبر کیجئے۔ چنانچہ آپ نے اس فریضہ کو بحسن وخوبی انجام دیا، پھر اپنی پوری قوم تک رب کا پیغام پہنچایا، پھر اپنے آس پاس کے عربوں کو دین کی دعوت دی، پھر آپ نے تمام عربوں کو شرک کے انجام بد سے ڈرایا، پھر آپ نے تمام دنیا والوں کو برے انجام سے ڈرایا اور توحید کی طرف آنے کی دعوت دی۔ آپ نبوت ملنے کے بعد دس سال سے کچھ زائد عرصہ تک قتال کئے بغیر اور جزیہ نافذ کئے بغیر دعوت دیتے رہے۔ اس مرحلہ میں آپ کو صبر کرنے اور لوگوں کو درگزر کرنے کی تعلیم دی گئی۔۔۔ پھر آپ کو ہجرت کرنے کی اجازت ملی اور ان لوگوں سے قتال کا حکم دیا گیا جو آپ سے قتال کریں اور جو لوگ غیر جانب دار ہوں ان سے قتال نہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد تمام مشرکین سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا یہاں تک کہ اللہ کا دین غالب آجائے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [آپ کا تعلق مکہ شہر سے تھا پھر آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر میں آپ کے خاندان کے افراد اور خویش واقارب رہتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شہر سے بہت محبت تھی۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ خاص مکہ شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ کی ولادت عام الفیل میں ہوئی یعنی اس سال جس سال ابرہہ خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے ہاتھی پر سوار ہو کر آیا تھا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہجرت کی تفصیل یہ ہے کہ آپ مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ تشریف لے گئے اور باقی عمر وہیں بسر کی، وہیں آپ کی وفات ہوئی اور وہیں مدفون ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے مدینہ کو خیر وبرکت حاصل ہوئی۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو شرک سے متنبہ کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث کیا، آپ لوگوں کو توحید کی طرف بلاتے تھے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''یَا أَیُّھَا

الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ، وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ، وَلا تَمْنُن تَسْتَكْثِرُ، وَلِرَبِّكَ فَاصْبِر"(قُمْ فَأَنذِرْ) کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں کو شرک سے متنبہ کریں اور توحید کی دعوت دیں۔(وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ)کا مطلب یہ ہے کہ آپ توحید کے ذریعہ اپنے رب کی عظمت کا اظہار کریں۔(وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ)کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے اعمال کو شرک سے پاک رکھئے۔(وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ)میں رجز کے معنیٰ اصنام(بتوں) کے ہیں اور ھجر کا مطلب ہے بتوں اور ان کی پرستش کرنے والوں سے قطع تعلق کرنا،بتوں اور مشرکین سے اظہار براءت کرنا]

تمام رسولوں کی دعوت کی اصل وبنیاد یہی توحید کی دعوت اور شرک سے بچنے کی تاکید ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِي إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ "اس آیت کی تشریح میں ابن جریر طبری کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کہتا ہے اے محمد! میں نے آپ سے پہلے جو بھی رسول کسی قوم میں بھیجا تو اسے یہ وحی کی کہ آسمانوں اور زمین میں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے جو عبادت کے لائق ہو۔(فَاعْبُدُونِ)لہذا تم لوگ عبادت کو میرے لئے خاص کرو اور صرف مجھے اپنا معبود تسلیم کرو۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [(وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ)یعنی توحید کے ذریعہ اپنے رب کی عظمت و کبریائی بیان کرو۔]

ابن جریر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کہتا ہے: اے محمد! وہ تیرا رب ہے لہذا تم اس کی عبادت کے ذریعہ اس کی عظمت کا اظہار کرو اور اپنی ضرورتوں کو اس کے سامنے پیش کرو، اس کے علاوہ کسی باطل معبود یا اس کے باطل ہمسر کی طرف متوجہ نہ ہو۔

شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ ایک جگہ لکھتے ہیں:(وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ)کا مطلب یہ ہے کہ آپ اخلاص کے ذریعہ اس کی عظمت کا اظہار کریں۔اس سے اذان وغیرہ میں اللہ اکبر کہنا مراد نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی مشروعیت مدینہ میں ہوئی اور سورہ مدثر کی یہ آیات مکہ میں نازل ہوئیں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول:[وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ،یعنی اپنے اعمال کو غلاظت سے پاک کیجئے]

یہ اس آیت کے سلسلہ میں سلف سے منقول تفسیروں میں سے ایک ہے۔

قتادہ کہتے ہیں: (وثیابک فطھر) کا مطلب یہ ہے کہ آپ اسے گناہوں سے پاک رکھئے۔ عرب وعدہ خلافی کرنے والے کو ''دنس الثیاب'' (گندے کپڑے والا) کہتے تھے اور وفادار کو ''مطھر الثیاب'' (پاک کپڑے والا) کہتے تھے۔

آیت کی یہی تفسیر زیادہ مناسب ہے۔ اس لئے کہ یہ مفہوم اس آیت کے ماقبل ومابعد سے ہم آہنگ ہے۔

اس سے ماقبل کی آیت میں آگاہ و متنبہ کرنے اور رب کی عظمت کا اظہار کرنے کا حکم ہے اور مابعد کی آیت میں بتوں کو چھوڑنے اور ان سے اظہار براءت کرنے کا حکم ہے۔

صحیحین میں یہ حدیث منقول ہے: مجھ پر سورہ مدثر کی آیات ''يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ، قُمْ فَأَنذِرْ، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ'' نماز کی فرضیت سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔

(وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ) کی تفسیر میں دوسرا قول یہ ہے کہ اپنے کپڑے کو نجاست سے پاک رکھئے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: سلف وخلف میں سے تمام مفسرین کا یہ موقف ہے کہ اس آیت میں ''الثیاب'' (کپڑے) سے مراد قلب (دل) اور طہارت سے مراد اعمال اور اخلاق کی اصلاح ہے۔

شیخ ابن باز رحمہ اللہ کا قول ہے: اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال کو شرک سے پاک کیجئے، اس لئے کہ یہاں کپڑوں کو پاک کرنا مراد نہیں ہے، کیونکہ اس وقت نماز فرض نہیں ہوئی تھی، اسی وجہ سے یہاں اعمال مراد ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لِباسُ التَّقْوى ذلِكَ خَيْرٌ'' (اور تقویٰ کا لباس ہی بہتر ہے) اس آیت میں عمل کو لباس کہا گیا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [وَالرُّجْزَ: یعنی اصنام (بت)۔]

اس کی تفسیر صحیحین کی روایت میں مذکور ہے۔ حدیث کے راوی ابو سلمہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس سے مراد بت ہیں اہل جاہلیت جن کی پرستش کرتے تھے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [ھجر سے مراد بتوں اور انہیں پوجنے والوں سے تعلق ختم کرنا اور ان سب سے اظہار براءت کرنا ہے۔]

بتوں کو چھوڑنے میں یہ شامل ہے کہ انہیں بالکل ترک کر دیا جائے، ان کا انکار کیا جائے، ان کی عبادت نہ کی جائے اور بتوں کے پجاریوں سے قطع تعلق کر کے ان سے اظہار براءت کی جائے۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [دس سال تک اِسی حال میں رہے کہ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے تھے۔ دس سال کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان پر لے جایا گیا اور آپ پر پانچ وقت کی نمازیں فرض کی گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سال تک مکہ میں نماز ادا کی، اس کے بعد آپ کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا۔]

آپ صلی اللہ علیہ وسلم رسالت سے سرفراز کئے جانے کے بعد مکہ میں تیرہ سال تک رہے۔ ان میں سے دس سال تک آپ لوگوں کو توحید کی دعوت دیتے رہے۔

ان دس سالوں میں نماز[1]، روزے وغیرہ کی فرضیت نہیں ہوئی، نہ شراب حرام کی گئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بیت المقدس کی سیر کرائی گئی، پھر وہاں سے آسمان پر لے جایا گیا، وہاں پانچ نمازیں فرض کی گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سال تک مکہ میں نماز ادا کی، پھر مدینہ ہجرت کر گئے۔ وہاں دیگر فرائض سے متعلق احکام نازل ہوئے۔ عنقریب مصنف رحمہ اللہ اس کی تفصیل بیان کریں گے۔ ان شاء اللہ۔

مسئلہ: نبوت کے دسویں سال مکہ میں نماز فرض کی گئی۔ آپ نے تین سال تک مکہ میں نماز ادا کی۔ ابتداء میں پچاس وقت کی نماز فرض کی گئی تھی، پھر ان میں تخفیف کر کے پانچ وقت کی نماز کر دی گئی جن پر پچاس وقت کی نمازوں کا اجر حاصل ہو گا۔[2] صحیحین میں یہ روایت آئی ہے: ''یہ پانچ وقت کی نماز ہے جو پہلے پچاس وقت کی تھی، میرے پاس بات بدلی نہیں جاتی۔''

1۔ کچھ علماء کا کہنا ہے کہ شروع میں جیسا کہ سورہ طہ میں ''وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا'' اور سورہ ق میں ہے ''وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ'' یہ دو رکعات کی نماز تھی۔ اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔
ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ روایت آئی ہے کہ ابتداء میں نماز کی فرضیت اس طرح ہوئی تھی کہ صبح میں دو رکعات اور شام میں دو رکعات ادا کی جاتی تھی۔

2۔ پچاس وقت کی نماز کی فرضیت کے بعد اس پر عمل کی نوبت نہیں آئی بلکہ یہ حکم زمین پر آنے سے قبل ہی اس میں تخفیف کر دی گئی جیسا کہ صحیحین میں منقول حدیث اسراء میں اس کا ذکر ہے۔ یہ عمل سے پہلے منسوخ ہو جانے کے قبیل سے ہے۔

شروع میں دو رکعات نماز فرض کی گئی تھی۔ عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں: شروع میں دو رکعات نماز فرض کی گئی تھی، سفر کی نماز اپنی اصل پر باقی رکھی گئی اور حالت قیام کی نماز مکمل کر دی گئی۔ (متفق علیہ)

ابن حبان میں یہ روایت ان الفاظ کے ساتھ آئی ہے: سفر و حضر کی نماز دو رکعات فرض کی گئی تھی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں قیام فرمایا تو حالت قیام کی نماز میں دو رکعات کا اضافہ کر دیا گیا، لمبی قراءت کی وجہ سے فجر کی نماز کو اپنی اصل پر چھوڑ دیا گیا اور مغرب کی نماز تین رکعات کر دی گئی اس لئے کہ وہ دن کا طاق عدد ہے۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: روایت میں آیا ہے کہ شروع میں دو رکعات صبح اور دو رکعات شام کی نماز فرض کی گئی تھی۔ پھر معراج کی رات پانچ وقت کی نمازیں فرض کی گئیں۔ یہ نمازیں دو دو رکعات تھیں۔ ہجرت کے بعد حالت سفر کی نماز کو اپنی حالت پر باقی رکھا گیا اور حالت قیام کی نماز میں اضافہ کیا گیا۔ نماز کے احکام بتدریج مکمل کئے گئے۔ شروع میں لوگ نماز میں کلام کرتے تھے، نیز نماز میں تشہد بھی نہیں تھا، پھر تشہد کا حکم دیا گیا اور دوران نماز بات کرنے کو حرام قرار دیا گیا۔ اسی طرح مکہ میں نماز کے لئے اذان نہیں تھی، ہجرت کے بعد مدینہ میں اذان کی مشروعیت ہوئی۔ اسی طرح جمعہ، عیدین، سورج گرہن، استسقاء اور تراویح وغیرہ کی نمازیں ہجرت کے بعد مدینہ میں مشروع ہوئیں۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [دس سال کے بعد آپ کو آسمان پر لے جایا گیا۔]

گویا مصنف رحمہ اللہ نے اس قول کو ترجیح دیا ہے کہ ہجرت سے تین سال پہلے اسراء و معراج کا واقعہ پیش آیا۔

ابن رجب حنبلی فتح الباری میں کہتے ہیں: زیادہ مشہور یہی قول ہے۔

اس معاملہ میں اہل علم کے درمیان بہت زیادہ اختلاف ہے۔ یہ اختلاف معراج کے سال و ماہ دونوں کے تعلق سے ہے۔ ابن حزم نے مبالغہ کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ہجرت سے ایک سال قبل معراج کا واقعہ پیش آیا، اس پر سب کا اجماع ہے۔ نووی نے بھی تاکید کے ساتھ اسی موقف کا اظہار کیا ہے، لیکن ابن حجر نے فتح الباری میں اس قول کی تردید کی ہے اور اس مسئلہ میں دس اقوال نقل کئے ہیں۔

اس سے معراج کی مناسبت سے جشن منانے کے بدعت ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے، اس لئے کہ اس کا کوئی حتمی وقت (ماہ و سال) معروف نہیں ہے۔ اگر اس موقع و مناسبت سے جشن منانا صحیح ہوتا تو ہم سے پہلے ان لوگوں نے جشن منایا ہوتا جو ہم سے زیادہ خیر کے متلاشی تھے، لیکن وہ کیسے جشن مناتے جبکہ معراج کی رات کی تعیین کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے ضمن میں مذکورہ بالا احوال ذکر کئے ہیں۔ سیرت نبوی کی یہ بنیادی معلومات ہر مسلمان کو ہونی چاہئے۔

ابن قیم رحمہ اللہ زاد المعاد میں رقمطراز ہیں: جب دنیا و آخرت میں بندہ کی سعادت و کامرانی کا انحصار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرنے میں ہے تو پھر وہ شخص جو اپنی خیر خواہی اور بھلائی کا خواستگار ہو اور جسے اپنی نجات و کامرانی عزیز ہو، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، طریقے اور احوال کا اتنا علم ضرور رکھے جس کے ذریعہ وہ ان سے ناواقف لوگوں کے زمرہ سے باہر نکل جائے اور آپ کے متبعین، مؤیدین اور حامیوں کی فہرست میں شامل ہو جائے۔ اس معاملہ میں لوگ تین طرح کے ہیں؛ وہ جن کے پاس کم علم ہے، وہ جن کے پاس زیادہ علم ہے اور وہ جو سیرت نبوی سے بالکل ناواقف ہیں۔ فضل اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا فضل والا ہے۔

ابن قیم نے اپنی دلچسپ و عمدہ کتاب ''زاد المعاد فی ہدی خیر العباد'' میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے طویل کلام کیا ہے جس کی طرف رجوع کرنا بہتر ہو گا۔ فائدہ کی تکمیل کے لئے یہاں ہم ابن قیم نے نبوت کے پہلے کے احوال کے تعلق سے جو کچھ لکھا اسے اختصار کے ساتھ نقل کر رہے ہیں۔ ایک مسلمان کے لئے ان احوال سے ناواقف ہونا مناسب نہیں ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاص مکہ شہر میں پیدا ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت اُسی سال ہوئی جس سال ابرہہ ہاتھی پر سوار ہو کر خانہ کعبہ کو منہدم کرنے کے لئے آیا تھا[1]۔ آپ کے والد کی وفات کے سلسلہ میں اختلاف ہے کہ آیا ان کی وفات تب ہوئی تھی جب آپ ابھی شکم مادر میں تھے یا آپ کی ولادت کے بعد ان کی وفات ہوئی اس سلسلہ میں دونوں طرح کے اقوال ہیں۔ ان میں زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ ان کی وفات تب ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شکم مادر میں تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان کی وفات آپ کی ولادت کے سات ماہ بعد ہوئی۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ کی والدہ کا انتقال مکہ اور مدینہ کے درمیان مقام ابواء میں ہوا جبکہ وہ آپ کے

1۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت مکہ میں حالت یتیمی میں سموار کے دن بارہ ربیع الاول کو ہاتھی والے واقعہ کے سال ہوئی۔ آپ کی ولادت کے تعلق سے یہی مشہور ہے۔ ابن اسحاق نے سند کے بغیر اس کی روایت کی ہے جیسا کہ سیرت ابن ھشام میں منقول ہے، لہذا یہ روایت ضعیف ہے۔ اسی لئے ماہر فلکیات محقق محمود پاشا کا موقف یہ ہے کہ آپ کی ولادت نو ربیع الاول کو ہوئی۔ دیکھئے: السیرۃ النبویۃ (ص 109) تالیف: مھدی احمد، طباعت اول۔ واللہ اعلم

ماموؤں سے مل کر مدینہ سے لوٹ رہی تھیں، اس وقت آپ کی عمر سات سال سے کم تھی۔ والدہ کے انتقال کے بعد آپ کی کفالت آپ کے دادا عبد المطلب نے کی۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آٹھ سال کے ہوئے تو دادا کا انتقال ہو گیا۔ ایک قول کے مطابق اس وقت آپ کی عمر چھ سال اور دوسرے قول کے مطابق دس سال تھی۔ اس کے بعد آپ کی کفالت آپ کے چچا ابو طالب نے کی۔ آپ سن شعور کو پہنچنے تک ان ہی کی کفالت میں رہے۔ جب آپ بارہ سال کے ہوئے تو آپ کے چچا آپ کو لے کر شام کے سفر پر گئے۔ ایک قول کے مطابق اُس وقت آپ کی عمر نو سال تھی۔ آپ نے پچیس سال کی عمر میں تجارت کے سلسلہ میں دوبار شام کا سفر کیا اور بصری پہنچے۔[1] اس سفر سے واپسی پر آپ نے خدیجہ بنت خویلد سے شادی کی۔ ایک قول کے مطابق آپ نے تیس سال کی عمر میں ان سے شادی کی۔ دوسرے قول کے مطابق اس وقت آپ کی عمر اکیس سال تھی۔ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی عمر اس وقت چالیس سال تھی۔ یہ پہلی خاتون ہیں جن سے شادی کرنے کے بعد ان کی موجودگی میں آپ نے کسی اور خاتون سے شادی نہیں کی اور یہ پہلی بیوی ہیں جن کا انتقال آپ کی زندگی میں ہوا۔ جب آپ کی عمر چالیس سال کی ہوئی تو نور نبوت آپ کے اوپر ضوفشاں ہوا۔ اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ کی بعثت سموار کے دن ہوئی۔[2] لیکن بعثت کس ماہ میں ہوئی؟ اس سلسلہ میں اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق آٹھ ربیع الاول کو آپ کی بعثت ہوئی، اکثر اہل علم کا یہی قول ہے۔ دوسرے قول کے مطابق آپ کی بعثت رمضان میں ہوئی تھی۔ ابن قیم رحمہ اللہ کی بات ختم ہوئی۔

آپ کی وفات مشہور قول کے مطابق سموار کے دن بارہ ربیع الاول سن دس ہجری میں ہوئی۔ ابن کثیر رحمہ اللہ کے بقول: اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ آپ کی وفات سموار کے دن ہوئی۔ مشہور قول کے مطابق آپ کی وفات بارہ ربیع الاول کو ہوئی۔ اس بنیاد پر جو لوگ آپ کی ولادت کا جشن مناتے ہیں ان سے کہا جائے گا کہ اگر مشہور قول کے مطابق آپ کی ولادت بارہ ربیع الاول کو ہوئی تو مشہور قول کے مطابق آپ کی وفات بھی بارہ ربیع الاول کو ہوئی۔ لہذا تم لوگ ان میں سے کس کا جشن مناتے ہو؟!

---

1. یہ شہر دمشق کے جنوب مشرق میں (140) کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔

2. صحیح مسلم کی روایت میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سموار کے روزہ کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اسی دن میری ولادت ہوئی اور اسی دن مجھ پر پہلی وحی نازل ہوئی۔

ہجرت کا مطلب ہے شرک کی سرزمین سے اسلام کی سرزمین کی طرف منتقل ہونا۔

اس امت پر ہجرت فرض ہے۔ انہیں شرک کی سرزمین سے اسلام کی سرزمین کی طرف منتقل ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ہجرت قیامت تک باقی رہے گی۔

اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلآئِكَةُ ظَالِمِي أَنْفُسِهِمْ قَالُواْ فِيمَ كُنتُمْ قَالُواْ كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الأَرْضِ قَالْوَاْ أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُواْ فِيهَا فَأُوْلَئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءتْ مَصِيرًا ۝ إِلاَّ الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاء وَالْوِلْدَانِ لاَ يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلاَ يَهْتَدُونَ سَبِيلاً ۝ فَأُوْلَئِكَ عَسَى اللّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ وَكَانَ اللّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ''(جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں جب فرشتے ان کی روح قبض کرتے ہیں تو پوچھتے ہیں تم کس حال میں تھے؟ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم اپنی جگہ کمزور اور مغلوب تھے۔ فرشتے کہتے ہیں کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم ہجرت کر جاتے؟ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ پہنچنے کی بری جگہ ہے مگر جو مرد، عورتیں اور بچے بے بس ہیں جنہیں نہ تو کسی چارۂ کار کی طاقت اور نہ کسی راستے کا علم ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر کرے۔ اللہ تعالیٰ درگزر کرنے والا اور معاف فرمانے والا ہے۔)

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی اس کی دلیل ہے: '' يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ أَرْضِي وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُونِ '' (اے میرے بندے جو ایمان لائے ہو، میری زمیں کشادہ ہے لہذا تم میری ہی عبادت کرو۔)

بغوی رحمہ اللہ کہتے ہیں: یہ آیت مکہ میں مقیم ان مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کہہ کر انہیں مخاطب کیا ہے۔

سنت نبوی سے ہجرت کی دلیل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے: ''ہجرت کا سلسلہ منقطع نہیں ہو گا یہاں تک کہ توبہ کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا اور توبہ کا سلسلہ منقطع نہیں ہو گا یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو جائے گا۔''[1]

اس اقتباس کا خلاصہ: اس میں ہجرت کی تعریف، اس کا حکم اور اس کی دلیل کو بیان کیا گیا ہے۔

جب مصنف رحمہ اللہ سیرت نبوی کو بیان کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا تو انہوں نے ہجرت کے تعلق سے کچھ اور باتیں مثلاً اس کی تعریف اور اس کا حکم (واجب ہونا) بھی بیان کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ہجرت کا حکم قیامت تک کے لئے باقی ہے۔ نیز انہوں نے اس کے تین دلائل بھی ذکر کئے ہیں:

پہلی دلیل میں ہجرت کے وجوب کو بیان کیا گیا ہے، کیونکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ ہجرت کو ترک کرنے والوں کا ٹھکانہ جہنم ہے۔

دوسری دلیل میں یہ بتایا گیا ہے کہ ہجرت کو ترک کرنے والا کافر نہیں ہے۔ پہلی آیت جو بطور دلیل ذکر کی گئی ہے، سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے۔ اسی لئے مصنف نے ان دونوں دلائل کے فوراً بعد بغوی کا کلام ذکر کیا ہے تاکہ یہ واضح کر دیں کہ جہنم میں یہ دخول ہمیشہ ہمیش کے لئے نہیں ہو گا، لہذا معلوم یہ ہوا کہ ہجرت کو ترک کرنا کفر نہیں ہے، اس لئے کہ آیت میں خطاب مسلمانوں سے ہے۔[2]

---

1. امام ابو داود اور امام نسائی نے اس روایت کو نقل کیا ہے، شیخ البانی نے الارواء میں اسے صحیح قرار دیا ہے۔

2. آیت سے یہ استنباط بہت عمدہ ہے۔ کاش مصنف رحمہ اللہ نے اس قول کو امام بغوی کی طرف منسوب نہ کیا ہوتا۔ اس لئے کہ تفسیر بغوی میں اس آیت کی تشریح میں بہت سے اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ امام بغوی کہتے ہیں:
مقاتل و کلبی کا قول ہے: یہ آیت مکہ کے کمزور مسلمانوں کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ اس میں اللہ تعالیٰ کہتا ہے: اگر تم لوگ مکہ میں رہ کر ایمان کا اظہار کرنے میں تنگی محسوس کرتے ہو تو تم وہاں سے مدینہ ہجرت کر جاؤ۔ (إِنَّ أَرْضِي) یعنی مدینہ کشادہ جگہ ہے، تم لوگ ہجرت کر کے وہاں چلے جاؤ اور اپنے ایمان و عمل کے تحفظ کے لئے کوشش اور جدوجہد کرو۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

تیسری دلیل میں یہ بات کہی گئی ہے کہ ہجرت کا حکم قیامت تک کے لئے باقی ہے۔

الھجرۃ لغوی اعتبار سے الھجر سے ماخوذ ہے اور ترک کرنے کے معنیٰ میں ہے۔ ہجرت کرنے والوں کو مہاجرین اسی لئے کہا گیا کہ انہوں نے اپنے دیار کو چھوڑ کر دوسرے دیار میں سکونت اختیار کی۔

شرعی اعتبار سے ہجرت کے دو معانی ہیں:

ا۔ عام ہجرت: عام ہجرت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن باتوں کو منع کیا ہے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے کہ ''مہاجر وہ ہے جو اللہ کی منع کردہ چیزوں کو چھوڑ دے۔''

= سعید بن جبیر کا قول ہے: جب کسی جگہ معصیت کے کاموں کو انجام دیا جارہا ہو تو تم لوگ وہاں سے نکلنے کی کوشش کرو، اس لئے کہ میری زمین بہت وسیع و عریض ہے۔

اسی طرح ہر وہ شخص جو کسی ایسے شہر میں سکونت پذیر ہو جہاں معصیت کے کاموں کو انجام دیا جاتا ہو اور وہ اسے روکنے پر قادر نہ ہو تو اس پر واجب ہے کہ وہ وہاں سے ہجرت کر کے ایسی جگہ چلا جائے جہاں اُسے اللہ کی عبادت کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

ایک قول یہ ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو مکہ سے ہجرت کرنے سے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان لوگوں نے یہ کہا تھا کہ اگر ہم اپنے گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرتے ہیں تو ہمیں بھوک اور معیشت کی تنگی کا اندیشہ ہے۔ ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور ہجرت ترک کرنے کے ان کے عذر کو قبول نہیں کیا۔

مطرف بن عبد اللہ کا قول ہے: (أَرْضِي وَاسِعَةٌ) کا مطلب ہے کہ تمہارے لئے میری روزی بہت وسیع ہے۔ لہذا تم اس سرزمین شرک و کفر سے باہر نکلو۔ بغوی کی بات ختم ہوئی۔

آیت کی تشریح میں اس طرح کے اقوال صرف امام بغوی ہی نے نقل نہیں کئے ہیں، بلکہ کئی مفسرین نے اسی طرح کی باتیں نقل کی ہیں۔ ابن الجوزی نے اپنی تفسیر (زاد المسیر) میں آیت کے مفہوم کی وضاحت میں تین اقوال نقل کئے ہیں:

پہلا قول: اس آیت میں ایمان لانے والے اہل مکہ سے خطاب ہے۔ ان سے کہا جارہا ہے کہ میری زمین یعنی مدینہ بہت وسیع و عریض ہے لہذا تم لوگ مکہ میں ظالموں کے ساتھ نہ رہو۔ ابو صالح نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے یہ بات کہی ہے۔ اسی طرح مقاتل کا قول ہے کہ یہ آیت مکہ کے کمزور مسلمانوں کے بارے میں نازل ہوئی تھی کہ اگر تم لوگ مکہ میں رہ کر ایمان کے اظہار میں تنگی محسوس کرتے ہو تو مدینہ کی سرزمین بہت وسیع ہے۔

دوسرا قول: یہ ہے کہ جب کسی علاقہ میں معصیت کے کام انجام دیئے جارہے ہوں تو تم وہاں سے نکل جاؤ۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ قول نقل کیا ہے۔ عطاء نے بھی یہ بات کہی ہے۔

تیسرا قول: یہ ہے کہ تمہارے لئے میرا رزق بہت کشادہ ہے۔ یہ مطرف بن عبد اللہ کا قول ہے۔

۲۔ خاص ہجرت: یعنی ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہونا۔

ابن حجر نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ اسلام میں ہجرت کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان دارالخوف سے دار الامن کی طرف منتقل ہو جیسا کہ حبشہ کی پہلی اور دوسری ہجرت میں ہوا۔ ابتدائی دور میں مکہ سے مدینہ کی ہجرت بھی اسی قبیل کی تھی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان دارالکفر سے دارالایمان کی طرف نقل مکانی کرے۔ اس مرحلہ کا آغاز اس وقت ہوا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ میں استحکام حاصل ہو گیا تھا۔ پھر بہت سے مسلمان جنہیں سہولت میسر تھی، ہجرت کر کے آپ کے پاس مدینہ پہنچے تھے۔ اس وقت ہجرت نقل مکانی کر کے مدینہ میں سکونت پذیر ہو جانے کے ساتھ خاص تھی، یہاں تک کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو یہ اختصاص باقی نہیں رہا۔ ابن حجر کی بات ختم ہوئی۔

جگہ کے اعتبار سے ہجرت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ عام ہجرت: اس کا مطلب یہ ہے کہ شرک کی سرزمین سے اسلام کی سرزمین کی طرف نقل مکانی کرنا۔ یہ ہجرت قیامت تک کے لئے باقی ہے۔

۲۔ خاص ہجرت: اس سے مراد مکہ سے مدینہ کی ہجرت ہے۔ اس ہجرت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''فتح مکہ کے بعد اب ہجرت نہیں ہے۔'' (متفق علیہ)

حکم کے اعتبار سے ہجرت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ وہ ہجرت جو واجب ہے: ایسا مسلمان جو دار الکفر میں مقیم ہو اور وہ اپنے دین کے اظہار پر قادر نہ ہو لیکن وہاں سے اسلام کی سرزمین کی طرف ہجرت کرنے پر قادر ہو تو اس پر ہجرت کرنا واجب ہے۔ اوپر متن کے اندر نقل کی گئی آیت کو ایسے ہی مسلمان پر محمول کیا جائے گا۔

ابن ہبیرہ کا قول ہے: جہاں تک مجھے علم ہے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ جو مسلمان ہجرت کرنے پر قادر ہو تو اس کے لئے دیار کفر سے دیار اسلام کی طرف ہجرت کرنا واجب ہے۔

ابن کثیر رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں کہتے ہیں: یہ آیت کریمہ ہر اُس شخص کے حق میں عام ہے جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو اور اپنے دین پر عمل کرنے پر قادر نہ ہو لیکن وہ وہاں سے دیار اسلام کی طرف ہجرت کرنے پر قادر ہو اس کے باوجود بھی اگر وہ وہاں سے ہجرت نہیں کرتا ہے تو وہ اپنے آپ پر ظلم کرنے والا ہے اور حرام کا مرتکب ہے، اس پر سب کا اجماع ہے۔ اس کی دلیل یہی آیت ہے جو اوپر متن میں نقل کی گئی ہے۔

ہمارے شیخ ابن عثیمین رحمہ اللہ کا قول ہے: یہ ہجرت ہر اس مومن پر واجب ہے جو کافروں کے شہر میں رہنے کی وجہ سے اپنے دین کے اظہار کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ ایسے شخص کا اسلام مکمل نہیں ہو گا جس کے لئے ہجرت کے بعد ہی اپنے دین پر عمل کرنا ممکن ہو۔ واجب پر عمل کرنے کے لئے جو چیز ضروری ہو وہ واجب ہے۔

۲۔ وہ ہجرت جو مستحب ہے: جو شخص اپنے شہر یا علاقہ میں دین کے اظہار کی استطاعت رکھتا ہو اور وہ ہجرت کرنے پر بھی قادر ہو تو ایسے شخص کے لئے ہجرت کرنا مستحب ہے۔ یہ جمہور کا قول ہے۔ ابن قدامہ اور ابن تیمیہ کا بھی یہی موقف ہے۔ ہاں اگر اسی جگہ مقیم رہنے میں کوئی مصلحت اور اپنی جان اور دین کے سلسلہ میں مامون ہو تو وہ وہاں رہ سکتا ہے۔

مسئلہ: کچھ علماء کا یہ موقف ہے کہ دین کے اظہار کی قدرت سے مراد یہ ہے کہ وہ اسلامی شعائر کے اعلان کی قدرت رکھنے کے ساتھ مشرکین کے دین سے عداوت اور اظہارِ براءت پر بھی قادر ہو۔ اس معاملہ میں اسلامی شعائر مثلاً اذان اور حجاب وغیرہ کے علانیہ اظہار پر قدرت رکھنا ہی کافی نہیں ہے۔

جو بات ظاہر ہے وہ یہ ہے کہ اس کا تعلق اُس مصلحت سے جو علماء نے بیان کی ہے بشرطیکہ کفار کے ساتھ مجاملت کی نوبت نہ آتی ہو یعنی یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہ پڑتی ہو کہ کفار کا دین بھی حق ہے یا جائز ہے۔ اس کی دلیل کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جو صحابہ کرام مکہ میں تھے وہ کھلم کھلا مشرکین کے دین سے عداوت کا اظہار کرنے پر قادر نہیں تھے مگر صرف ضرورت کے وقت بلکہ کچھ صحابہ تو مشرکین سے علیک سلیک کرنے اور ان کے ساتھ گھل مل کر رہنے پر مجبور تھے اور ان مشرکین میں سے بیشتر لوگ اس صحابی کے اسلام سے بھی ناواقف ہوتے تھے۔ اسی طرح وہ صحابہ کرام جو ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے تھے، نصاریٰ کے دین کے ساتھ کھلم کھلا اظہار عداوت نہیں کر سکتے تھے۔ واللہ اعلم۔

مسئلہ: شہر کفر کے سلسلہ میں کیا ضابطہ ہے؟

اس مسئلہ میں اہل علم کا بہت زیادہ اختلاف ہے۔

اس سلسلہ میں حق سے زیادہ قریب۔ واللہ اعلم۔ یہ قول ہے کہ جس شہر یا علاقہ میں کفر غالب ہو وہ شہر کفر یا دار الکفر ہے۔

ہمارے شیخ کا قول ہے: شہر کفر یا دار الکفر وہ ہے جہاں کفر کے شعائر کو علانیہ انجام دیا جاتا ہو اور اسلامی شعائر کو علانیہ انجام نہ دیا جاتا ہو مثلاً اذان، جماعت کی نماز، عیدین عمومی طور پر اجتماعیت کے ساتھ بڑے پیمانے پر جمعہ کا انعقاد۔ ہم نے عمومی طور پر اور اہتمام کے ساتھ جمعہ کے انعقاد کی بات اس لئے کہی ہے کہ اس زمرہ سے وہ شہر یا علاقہ نکل جائے جہاں محصور ہو کر کچھ اسلامی شعائر کو انجام دیا جاتا ہے مثلاً بلاد کفار جہاں مسلم اقلیتیں رہتی ہوں تو وہاں کی مسلم اقلیتیں جن شعائر اسلام پر عمل کرتی ہیں ان کی وجہ سے اُسے بلاد اسلام نہیں کہا جائے گا۔

بلاد کفار میں سکونت اختیار کرنے اور وہاں کا سفر کرنے کے حکم کے لئے دیکھئے: ہمارے شیخ الاسلام کی مجموع الفتاویٰ (۱۳۳/۶)

فائدہ: ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول ہے: ہم نے ان مسلمانوں کو دیکھا ہے جنہوں نے یہود و نصاریٰ کی معاشرت کو بہت حد تک اختیار کر لیا ہے وہ ان مسلمانوں سے ایمان میں بہت کمتر ہیں جو خالص اسلامی طرز حیات کے حامل ہیں۔

جب مدینہ میں دین کو ایک حد تک استحکام حاصل ہوا تو اسلام کے بقیہ احکام پر عمل کرنے کا حکم دیا گیا مثلاً زکوٰہ، روزہ، حج، اذان، جہاد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دس سال اسی حالت میں گزارے۔ اس کے بعد آپ کی وفات ہوگئی، آپ پر اللہ کی رحمتیں اور سلامتی ہو۔ آپ کا لایا ہوا دین آج تک باقی ہے۔

اس اقتباس کا خلاصہ: اس میں ان اسلامی احکام کو بیان کیا گیا ہے جن کی مشروعیت مدینہ میں اُن دس سالوں کے دوران ہوئی جنہیں آپ نے مدینہ میں گزارا، یہاں تک کہ اللہ کے حکم سے آپ کی وفات ہوگئی۔

مصنف رحمہ اللہ نے یہ بتایا ہے کہ عام اسلامی احکام کی فرضیت مدینہ میں ہوئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے اِن واجبات کی فرضیت کو مؤخر کیا تا آنکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین نے مدینہ ہجرت کرکے وہاں مستقل سکونت اختیار کی، دین کو استحکام حاصل ہوا اور لوگ مامون ہوگئے۔

ان میں سے اکثر احکام کی فرضیت سن دو ہجری میں ہوئی مثلاً اذان، روزہ اور زکوٰۃ۔ حج کی فرضیت صحیح قول کے مطابق ہجرت کے نویں سال میں ہوئی۔

ہمارے شیخ کہتے ہیں: ظاہر یہی ہے کہ نماز باجماعت کی فرضیت مدینہ ہی میں ہوئی، اس لئے کہ جس پکار کے ذریعہ نماز باجماعت کی دعوت دی جاتی ہے یعنی اذان، اس کی فرضیت سن ۲ ہجری میں ہوئی۔

مصنف کے کلام سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ زکاۃ کی فرضیت مدینہ میں ہوئی۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اصل زکاۃ کی مشروعیت مکہ میں ہو چکی تھی جیسا کہ مکی سورہ الانعام میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ "(اور فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو) نیز مکی سورۃ المعارج میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ "(اور جو لوگ اپنے مالوں سے سائل و محروم کے حق کو جانتے ہیں۔)

لیکن زکاۃ کی وصولی، کن اموال میں زکاۃ فرض ہے اس کی تعیین، زکاۃ کے نصاب کی تعیین اور زکاۃ کا مال کن لوگوں پر خرچ کیا جائے گا، یہ سارے احکام مدینہ میں سن ۲ ہجری میں نازل ہوئے۔

زکاۃ کی فرضیت صدقۂ فطر کی فرضیت کے بعد ہوئی۔ اس کی دلیل قیس بن سعد رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زکاۃ کے احکام نازل ہونے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کرنے کا حکم دیا۔ زکاۃ کے احکام نازل ہونے کے بعد آپ نے ہمیں نہ تو صدقۂ فطر ادا کرنے کا حکم دیا اور نہ اس سے منع کیا۔ ہم لوگ پہلے ہی کی طرح اس کی ادائیگی کرتے تھے۔ امام نسائی نے اس روایت کو نقل کیا ہے اور شیخ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔ امام نسائی نے اس روایت کو نقل کرنے سے پہلے یہ باب قائم کیا ہے:"باب: فرض صدقة الفطر قبل نزول الزكاة" (زکاۃ کے احکام نازل ہونے سے پہلے صدقۂ فطر کی فرضیت ہوئی۔)

اس میں یہ دلیل ہے کہ نصاب کے مطابق اموال کی زکاۃ کی ادائیگی کے مستحقین سے متعلق احکام مدینہ میں نازل ہوئے۔ اس لئے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ صدقۂ فطر کی فرضیت مدینہ میں ہوئی، کیونکہ صدقۂ فطر رمضان کے روزے سے متعلق ہے اور رمضان کے روزے ہجرت کے دوسرے سال فرض ہوئے تھے۔ اس پر سب کا اجماع ہے۔

رہا مصنف کا یہ قول کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی فرضیت بھی مدینہ میں ہوئی تو اس میں اشکال ہے۔ اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے مکہ ہی میں وجوبی طور پر اس بات کے لئے مامور تھے کہ آپ لوگوں کو توحید کی طرف بلائیں اور شرک سے روکیں۔ اسی طرح نماز کا حکم بھی ہجرت سے پہلے مل چکا تھا۔

ممکن ہے مصنف کی مراد عام مسلمانوں سے ہو یعنی مکہ میں تمام مسلمانوں پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ عائد نہیں ہوا تھا، اس لئے کہ مکہ میں مسلمانوں کو اپنے دین کو چھپانے کی اجازت حاصل تھی۔ واللہ اعلم

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین اب تک باقی ہے۔] اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ دین ہے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے قیامت تک کے لئے پسند کر لیا ہے۔ اب لوگوں کو اپنے تمام مفادات کی تکمیل اور دنیا و آخرت کی بھلائی کے لئے اسی آخری دین کے مطابق زندگی گزارنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" وَ رَضيتُ لَكُمُ الإِسْلامَ ديناً "(اور میں تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر راضی ہو گیا۔) جو شخص اس دین کے علاوہ میں کامیابی و سربلندی کا متلاشی ہو گا اللہ تعالیٰ اسے ذلیل و رسوا کر دے گا، اگرچہ کچھ مدت کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے۔ جو بھی خیر ہے آپ نے اس کی طرف امت کی رہنمائی کر دی ہے اور جو بھی شر ہے آپ نے امت کو اس سے متنبہ و آگاہ کر دیا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر کے جن کاموں کی طرف امت کی رہنمائی کی ہے ان میں توحید اور وہ سارے اعمال شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور ان سے خوش ہوتا ہے اور شر کے جن کاموں سے آپ نے امت کو متنبہ کیا ہے ان میں شرک اور وہ تمام کام شامل ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے۔

اس اقتباس کے تحت اس دین کی عظمت اور کمال کو بیان کیا گیا ہے جسے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے۔

مصنف رحمہ اللہ نے پہلے یہ ذکر کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین قیامت تک کے لئے باقی ہے۔ پھر انہوں نے اس سبب کی وضاحت کی ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے لئے قیامت تک کے لئے اس دین کو پسند کر لیا ہے اور وہ سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کو مکمل کر دیا ہے، اس میں کوئی کمی یا نقص باقی نہیں رکھا ہے۔ جو بھی خیر تھا اس کی طرف رہنمائی کر دی ہے اور جو بھی شر تھا اُس سے آگاہ کر دیا ہے۔ اس کے بعد لوگ اپنے دینی و دنیاوی کسی بھی طرح کے فائدے کے لئے اس دین کے علاوہ کسی اور چیز کے محتاج نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:'' وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ''(آپ کے رب کا کلام سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے۔)یعنی خبروں کے اعتبار سے سچا ہے اور احکام کے اعتبار سے عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

توحید وہ سب سے اہم سرمایۂ حیات ہے جس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی کی ہے اور شرک وہ سب سے بڑا گناہ جس سے آپ نے متنبہ کر دیا ہے۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: اللہ سبحانہ نے دین اسلام کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ مکمل کر دیا ہے۔ دین کی تکمیل کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے بعد آپ کی امت کو کسی عقل و نقل یا رائے، خواب و کشف کا محتاج نہیں بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:'' الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ

الْإِسْلَامَ دِينًا "(آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔) اور اللہ تعالیٰ نے اس شخص پر نکیر کی ہے جس کے لئے وحی الٰہی کافی نہیں ہے۔ ارشاد ہے:" أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ "(کیا انہیں یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمادی جو ان پر پڑھی جارہی ہے۔ اس میں رحمت بھی ہے اور نصیحت بھی ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔)

ابن قیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت جس طرح ہر مکلف کے لئے عام ہے۔ آپ کی رسالت جس طرح دین کے اصول و فروع اور چھوٹی بڑی ہر چیز کے لئے عام ہے کہ کوئی بھی مکلف انسان آپ کی رسالت کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتا ہے اُسی طرح کوئی ایسا حکم نہیں ہے جس کی امت کو ضرورت ہو اور وہ آپ کی رسالت کے دائرہ سے باہر ہو اور آپ نے اُسے بیان نہ کر دیا ہو۔

سعدی کہتے ہیں: کوئی مکلف انسان اگر یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کو اپنے عقائد اور احکام کو جاننے کے لئے قرآن و سنت کے علوم کے بجائے علم کلام وغیرہ کی ضرورت ہے تو وہ جاہل ہے اور اس کا دعویٰ باطل ہے۔ گویا اس نے یہ سمجھ لیا کہ جو بات وہ کہہ رہا ہے اور جس چیز کی دعوت دے رہا ہے اس کے بغیر دین مکمل نہیں ہو گا۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے، گویا اس نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف جہالت کی نسبت کر دی۔

ابن قیم رحمہ اللہ اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں: اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حالت میں ہوئی کہ آپ نے آسمان میں اڑتے ہوئے ہر پرندہ کے بارے میں ایک علم اپنی امت کو سکھایا۔ آپ نے اپنی امت کو ہر بات سکھائی، یہاں تک کے پیشاب اور پاخانہ کے آداب، مباشرت کے آداب، سونے، کھڑے ہونے، بیٹھنے، کھانے، پینے، سوار ہونے، سواری سے اترنے، سفر کرنے، قیام کرنے، خاموش رہنے، کلام کرنے، تنہائی میں رہنے، لوگوں کے ساتھ گھلنے ملنے، مالداری، محتاجی، صحت، بیماری وغیرہ، زندگی کے تمام احکام سکھائے۔ نیز آپ نے موت کے بارے میں بتایا، اللہ تعالیٰ کے عرش، کرسی، فرشتے، جن، جہنم، جنت، روز قیامت اور اس دن جو کچھ ہو گا سب کے بارے میں اس قدر بتادیا ہے کہ گویا سارے مناظر آنکھوں کے سامنے ہوں۔ آپ نے لوگوں کو ان کے معبود اور الہ کے بارے میں ساری باتیں بتادی ہیں گویا کہ وہ اپنے معبود کو اپنی آنکھوں سے اس کے تمام اوصاف کمال اور جلیل الشان صفات کے ساتھ دیکھ رہے ہوں۔ آپ نے انبیائے کرام اور ان کی قوموں کے بارے میں اتنی وضاحت سے ساری باتیں بتادی ہیں کہ گویا اُسے سننے اور پڑھنے والے ان نبیوں اور ان کی قوموں کے ساتھ

موجود ہوں۔ آپ نے خیر و شر کے راستوں اور ان سے متعلق تمام چھوٹی بڑی چیزوں کے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا ہے کہ آپ سے پہلے کسی نبی نے اپنی امت کو اتنی معلومات فراہم نہیں کی تھی۔ آپ نے موت کے احوال، موت کے بعد برزخ کے احوال، اس کی نعمتوں اور عالم برزخ میں روحانی و جسمانی عذاب کی اتنی تفصیل بیان کر دی ہے کہ آپ کے علاوہ کسی نبی نے اتنی تفصیل نہیں بتائی تھی، اسی طرح آپ نے توحید، نبوت اور آخرت کے تمام ممکنہ دلائل بیان کر دیئے ہیں اور کفار و گمراہ لوگوں کے تمام فرقوں و گروہوں کی ایسی تردید کر دی ہے کہ اِسے جان لینے کے بعد کسی اور علم کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، ہاں البتہ اس کے لئے ضرورت باقی رہتی ہے جسے ان باتوں کی تبلیغ کرنی ہو اور جن کے سامنے ان احوال کے پوشیدہ حقائق کو مزید کھول کر وضاحت کے ساتھ بیان کرنا ہو۔ اسی طرح آپ نے جنگوں کے داؤ پیچ، دشمن سے مڈبھیڑ، اللہ کی مدد حاصل کرنے کے راستے اور جنگ میں کامیاب ہونے کے اسرار و رموز کو اس حد تک بیان کر دیا ہے کہ لوگ اگر اسے جان لیں، سمجھ لیں اور کماحقہ اس کا اہتمام کر لیں تو کوئی دشمن ان کے سامنے کبھی ٹک نہیں پائے گا۔ اسی طرح آپ نے لوگوں کے لئے ابلیس کی عیاری و مکاری، اس کے اثر انداز ہونے کے راستے، اس کے مکر و فریب اور اس کے شر سے محفوظ رہنے کے طریقے کو اس قدر شرح و بسط کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ اس کے بعد اور کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے۔ اسی طرح آپ نے لوگوں کے لئے ان کی اپنی ذات کے احوال، اوصاف، خفیہ باتوں اور رازوں کو اس طرح بیان کر دیا ہے کہ اس کے بعد مزید کسی چیز کی حاجت باقی نہیں رہتی ہے۔ اِسی طرف آپ نے معیشت و اقتصاد کے بارے میں اتنا کچھ بتا دیا ہے کہ اگر لوگ اُسے جان لیں اور آپ کی باتوں پر عمل پیرا ہو جائیں تو ان کی دنیا کی زندگی بھی آخری حد تک مضبوط و مستحکم ہو جائے۔

مختصر یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا و آخرت کی تمام بھلائیوں کو لے کر آئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کے معاملہ میں انسانوں کو آپ کے علاوہ کسی کا محتاج نہیں بنایا ہے۔ پھر کیسے کوئی یہ سمجھتا ہے کہ آپ کی لائی ہوئی مکمل شریعت جس سے زیادہ کامل کوئی شریعت آج تک دنیا میں نہیں آئی، ناقص ہے اور اس میں ایسی خارجی سیاست و تدبیر کی ضرورت ہے جو اسے مکمل کر دے یا ایسے قیاس یا حقیقت یا عقلی بات کی ضرورت ہے جو اس مکمل شریعت کے دائرہ سے باہر ہے؟ اگر کوئی شخص اِس طرح کا گمان رکھتا ہے تو گویا وہ اس شخص کی طرح ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک دوسرے رسول کی ضرورت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آپ کی لائی ہوئی شریعت ایسا گمان کرنے والوں کے سامنے پوری طرح واضح نہیں ہو سکی ہے۔ نیز اُسے اس فہم و فراست کا وہ وافر حصہ نصیب نہیں ہوا جس سے اصحاب نبی بہرہ ور ہوئے تھے۔ انہوں نے آپ کی لائی ہوئی شریعت پر اکتفاء کیا اور اس کے علاوہ سے مستغنی ہو گئے۔ اِسی کے ذریعہ انہوں نے دلوں اور ملکوں کو فتح کیا۔ ان کا یہ کہنا تھا

کہ یہ عہد وپیمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے لیا ہے اب یہ امانت ہم تمہارے سپرد کر رہے ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے حدیث بیان کرنے سے منع کرتے تھے، انہیں اندیشہ تھا کہ لوگ اس میں مشغول ہونے کی وجہ سے قرآن سے غافل ہو جائیں گے۔ آج جب وہ لوگوں کو اپنے آراء وافکار، گھٹیا خیالات و نظریات اور ذہن ودماغ کی گندگی و آلائش میں مشغول دیکھتے جبکہ انہوں نے اس کی وجہ سے قرآن وحدیث سے منہ موڑ لیا ہے تو ان کی کیا حالت ہوتی؟! اللہ تعالیٰ ہی سے مدد کا طالب ہوں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ "(کیا انہیں یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب نازل فرمادی جو ان پر پڑھی جارہی ہے۔ اس میں رحمت بھی ہے اور نصیحت بھی ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں۔)" دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ "(اور ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل فرمائی ہے جس میں ہر چیز کا شافی بیان ہے اور ہدایت اور رحمت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے۔) ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" يٰاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِى الصُّدُوْرِ ۙ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ " (اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو نصیحت ہے اور دلوں میں جو روگ ہیں ان کے لئے شفا ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت ہے ایمان والوں کے لئے۔) وہ کتاب دلوں کے روگ کے لئے کیسے باعث شفا ہو سکتی ہے جو سنت کے بیان کردہ شریعت کے عشر عشیر کے برابر بھی نہیں ہے؟ یا وہ کتاب دلوں کے روگ کے لئے کیسے باعث شفا ہو سکتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کے اسماء وصفات اور افعال کی معرفت کے مسائل میں سے ایک مسئلہ میں بھی یقین حاصل نہیں ہوتا ہے؟ اس کی عام باتیں ظاہری الفاظ ہیں، ان کی دلالت اس پر موقوف ہے کہ دس امور نہ پائے جاتے ہوں جبکہ ان امور کا نہ پایا جانا معلوم ہی نہیں ہے۔ اللہ کی ذات پاک اور بے عیب ہے۔ یہ تو عظیم بہتان ہے۔ حیرت اس بات پر ہے کہ صحابہ کرام و تابعین ان خود ساختہ قوانین کو وضع کئے جانے سے پہلے جس کی عمارت کو اللہ نے جڑ سے اکھاڑ دیا ہے اور انسانی آراء، پیمانے اور احوال کے سامنے آنے سے پہلے راہ ہدایت پر تھے جبکہ وہ نصوص پر اکتفاء کرتے تھے یا راہ ہدایت پر نہ تھے؟ یہاں تک کہ یہ متاخرین آئے اور اچانک صحابہ و تابعین سے زیادہ علم والے، ان سے زیادہ ہدایت یافتہ، شریعت کی باریکیوں کو ان سے زیادہ محفوظ رکھنے والے بن گئے۔ نیز یہ متاخرین قرن اول کے ان لوگوں سے زیادہ اللہ، اس کے اسماء و صفات اور جو کچھ اللہ کے لئے واجب و ممنوع ہے، ان سب کو جاننے والے بن گئے؟ اللہ کی قسم! اس کا کوئی بندہ شرک کے علاوہ

ہر قسم کے گناہ کے ساتھ اللہ سے ملاقات کرے یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ اس فاسد گمان اور باطل اعتقاد کے ساتھ ملاقات کرے۔ ابن قیم رحمہ اللہ کی بات ختم ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انسانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے مبعوث کیا ہے اور تمام جنات وانسان پر آپ کی اطاعت فرض کی ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:"قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعاً"(آپ کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول ہوں۔)

اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ دین کو مکمل کر دیا ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا "(آج میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنا انعام بھرپور کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کے دین ہونے پر رضامند ہو گیا۔)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وفات کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُمْ مَيِّتُونَ ، ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ " (یقیناً خود آپ کو بھی موت آئے گی اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں، پھر تم سب کے سب قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جھگڑو گے۔)

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا عمومی بیان ہے، اس بات کی وضاحت ہے کہ تمام انسان وجنات پر آپ کی اطاعت فرض ہے۔ نیز اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ کی وفات سے پہلے دین مکمل ہو چکا ہے۔

اس بات کی دلیل کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت انسان وجنات، عرب وعجم اور کالے وگورے سب کے لئے ہے اور آپ کی رسالت ماقبل کے تمام ادیان کو منسوخ کرنے والی ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعاً"(آپ کہہ دیجئے اے لوگو! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول ہوں۔)اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:" وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ"(میں نے آپ کو تمام جہان والوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔)ایک

دوسری جگہ اللہ کا ارشاد ہے:" وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا وَنَذِيرًا "(ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے خوشخبریاں سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔)

جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"مجھے ایسی پانچ چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں عطا کی گئیں۔ ایک ماہ کی مسافت تک میرے رعب و دبدبہ کے ذریعہ میری مدد کی گئی ہے، میرے لئے زمین کو سجدہ گاہ اور پاکی کا ذریعہ بنایا گیا ہے، میری امت کا جو بھی شخص نماز کا وقت پالے وہ جہاں ہے وہیں نماز ادا کرے، میرے لئے مال غنیمت کو حلال کیا گیا ہے، پہلے نبی خاص طور پر اپنی قوم میں مبعوث کئے جاتے تھے، مجھے تمام لوگوں کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔"(متفق علیہ) یہ صحیح بخاری کے الفاظ ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے: ہر نبی خاص طور پر اپنی قوم میں مبعوث کئے جاتے تھے، مجھے ہر سرخ و سیاہ کے لئے مبعوث کیا گیا ہے۔

اس کے بعد مصنف رحمہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ دین کو مکمل کئے جانے کی دلیل، پھر آپ کے وفات پانے کی دلیل ذکر کی ہے۔

اس کے ساتھ ہی مصنف رحمہ اللہ نے تیسری اصل یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جاننے پہچاننے سے متعلق اپنی بات مکمل کر دی ہے۔

تیسری اصل کا خلاصہ: اس اصل کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً آپ کا نام ونسب، عمر، جائے پیدائش، وفات کی جگہ، آپ کی دعوت کی اصل وبنیاد، اس شریعت کے اصول جو آپ پر اور آپ کی امت پر فرض کی گئی ہے جو شریعت آپ لے کر آئے تھے اس کے مکمل ہونے کی خبر، اس بات کی وضاحت کہ آپ کی لائی ہوئی شریعت وہ آخری شریعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قیامت تک آنے والے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی سے اس کے علاوہ کوئی دوسری شریعت قبول نہیں کرے گا۔

لوگوں کے مرنے کے بعد انہیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى " (اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں پھر واپس لوٹائیں گے اور اسی سے پھر دوبارہ تم سب کو نکال کھڑا کریں گے۔) اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:"وَاللَّهُ أَنبَتَكُم مِّنَ الْأَرْضِ نَبَاتًا، ثُمَّ يُعِيدُكُمْ فِيهَا وَيُخْرِجُكُمْ إِخْرَاجًا"(اللہ نے تم کو زمین سے ایک (خاص اہتمام سے) اگایا ہے (اور پیدا کیا ہے، پھر تمہیں اُسی میں لوٹا لے جائے گا اور (ایک خاص طریقہ سے) پھر نکالے گا۔)

دوبارہ زندہ کئے جانے کے بعد لوگوں کا حساب و کتاب ہو گا اور ان کے اعمال کے حساب سے انہیں بدلہ دیا جائے گا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى "(تاکہ اللہ تعالیٰ برے عمل کرنے والوں کو ان کے اعمال کا بدلہ دے اور نیک کام کرنے والوں کو اچھا بدلہ عنایت فرمائے۔)

جس نے دوبارہ زندہ کئے جانے کو جھٹلایا اس نے کفر کیا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" زَعَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَن لَّن يُبْعَثُوا ۚ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ ۚ وَذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ "(ان کافروں نے خیال کیا ہے کہ دوبارہ زندہ نہ کئے جائیں گے، آپ کہہ دیجئے کہ کیوں نہیں، اللہ کی قسم! تم ضرور دوبارہ اٹھائے جاؤ گے، پھر جو تم نے کیا ہے اس کی خبر دیئے جاؤ گے اور اللہ پر یہ بالکل ہی آسان ہے۔)

یہ اس مفید رسالے کا تیسرا حصہ ہے۔ اس میں متفرق مسائل کا بیان ہے۔

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے، حساب وکتاب اور اچھے وبرے کا بدلہ دیئے جانے کو ثابت کیا گیا ہے۔ مصنف نے ان سب کی دلیلیں بھی ذکر کی ہیں اور اس کی تکذیب کرنے والوں کا حکم بیان کیا ہے۔

مصنف رحمہ اللہ نے تیسری اصل سے متعلق اپنی بات ختم کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی دلیل ذکر کر دینے کے بعد انسان کے مرنے، دوبارہ زندہ کئے جانے اور حساب وکتاب کے بارے میں بات شروع کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ ان چیزوں کا انکار کرنے والا کافر ہے۔ انہوں نے اس کی دلیل بھی ذکر کی ہے۔

ابن قاسم نے "الاصول الثلاثۃ" کے اپنے حاشیہ میں بتایا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کئے جانے کا انکار زمانہ جاہلیت کے لوگوں کا سب سے بڑا کفر تھا۔[1]

مرنے کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے اور حساب وکتاب کے مرحلہ سے گزرنے نیز آخرت کے دیگر مراحل کے بارے میں تفصیلی کلام ان شاء اللہ شرح الواسطیہ میں آئے گا۔

---

1. قرآن مجید میں تین آیات ایسی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ آخرت کے بارے میں قسم کھا کر لوگوں کو بتائیں:

۱۔ اللہ کا یہ ارشاد ہے: "قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتُبْعَثُنَّ" (آپ کہہ دیجئے کہ کیوں نہیں، اللہ کی قسم! تم ضرور دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔

۲۔ اللہ کا یہ ارشاد: "وَيَسْتَنبِئُونَكَ أَحَقٌّ هُوَ ۖ قُلْ إِي وَرَبِّي إِنَّهُ لَحَقٌّ" (اور وہ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کیا عذاب واقعی سچ ہے؟ آپ فرما دیجئے کہ ہاں قسم ہے میرے رب کی وہ واقعی سچ ہے۔

۳۔ اللہ کا یہ ارشاد ہے: "وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَأْتِينَا السَّاعَةُ ۖ قُلْ بَلَىٰ وَرَبِّي لَتَأْتِيَنَّكُمْ" (کفار کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی، آپ کہہ دیجئے کہ مجھے میرے رب کی قسم وہ یقیناً تم پر آئے گی۔)

اللہ تعالیٰ نے تمام رسولوں کو خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''رُسُلًا مُبَشِّرِينَ وَمُنْذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ''(ہم نے انہیں رسول بنایا ہے، خوشخبریاں سنانے والے اور آگاہ کرنے والے تاکہ لوگوں کی کوئی حجت اور الزام رسولوں کے بھیجنے کے بعد اللہ تعالیٰ پر نہ رہ جائے۔)

سب سے پہلے رسول نوح علیہ السلام ہیں اور سب سے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ خاتم النبیین یعنی نبوت کے سلسلہ کو ختم کرنے والے ہیں۔

اس بات کی دلیل کہ نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ''(یقیناً ہم نے آپ کی طرف اُسی طرح وحی کی ہے جیسے کہ نوح (علیہ السلام) اور ان کے بعد والے نبیوں کی طرف کی۔)

اللہ تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر قوم کے لئے ایک رسول کو مبعوث کیا جو انہیں ایک اللہ کی عبادت کرنے کا حکم دیتے تھے اور طاغوت (غیر اللہ) کی عبادت سے روکتے تھے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ''وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ''(ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔)

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو بھیج کر اور کتابیں نازل کر کے اپنے بندوں پر حجت قائم کر دی ہے۔ اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ تمام رسولوں کی رسالت کا بنیادی مقصد ایک اللہ کی عبادت کرنے اور اللہ کے سوا دیگر معبودوں

کی معبودیت کا انکار کرنے کی دعوت دینا تھا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ"(ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا کہ (لوگو!) صرف اللہ کی عبادت کرو اور اس کے سوا تمام معبودوں سے بچو۔"

مصنف رحمہ اللہ کا قول [سب سے پہلے رسول نوح علیہ السلام ہیں۔] نوح علیہ السلام سب سے پہلے رسول ہیں جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ کی نقل کردہ آیت سے معلوم ہوا۔ نیز حدیث شفاعت میں آیا ہے:"اے نوح! آپ زمین والوں کے لئے مبعوث کئے جانے والے سب سے پہلے رسول ہیں۔" (متفق علیہ)

مصنف رحمہ اللہ کا قول [آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، آپ خاتم النبیین یعنی سلسلہ نبوت کے خاتم ہیں۔] یہ بات آیات واحادیث کے تواتر سے ثابت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" خَاتَمَ النَّبِيِّينَ "(آپ سلسلہ نبوت کو ختم کرنے والے ہیں۔) رہا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں گے۔

فائدہ: نبیوں میں افضل سارے رسول ہیں۔ رسولوں میں افضل وہ پانچ رسول ہیں جو اولوالعزم[1](بلند عزم و ارادہ والے) کہلائے۔ ان پانچ رسولوں میں افضل محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس پر اہل علم کا اجماع ہے۔ آپ کے بعد ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ پھر بقیہ تین کے بارے میں اہل علم کا اختلاف ہے۔

ابن حجر کہتے ہیں: ابراہیم علیہ السلام کے بعد اِن میں افضل موسیٰ ہیں، پھر عیسیٰ ہیں، پھر نوح ہیں۔

---

1. وہ ہیں: نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم
قرآن میں ان سب کا تذکرہ دو جگہ آیا ہے۔ ایک سورۃ الاحزاب میں:" وَإِذْ أَخَذْنَا مِنَ النَّبِيِّينَ مِيثَاقَهُمْ وَمِنكَ وَمِن نُّوحٍ وَإِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ " اور دوسری جگہ سورۃ الشوریٰ میں:" شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَ مَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَ لَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ؕ"

ہمارے شیخ نے شرح لمعۃ الاعتقاد میں کہا ہے: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد افضل نوح اور عیسیٰ ہیں۔ ان دونوں میں زیادہ افضلیت کن کو حاصل ہے اس کے بارے میں یقینی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے، اس لئے کہ ان دونوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔

مسئلہ: نبی اور رسول کے مابین کیا فرق ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ اہل علم کا موقف یہ ہے کہ نبی و رسول کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ نبی و رسول کے مابین فرق ہے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:" وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ ------" اس آیت میں نبی اور رسول کا الگ الگ تذکرہ ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث بھی ہے جس میں رسولوں اور انبیاء کی تعداد کا تذکرہ ہے۔[1]

علماء نے نبی اور رسول کے درمیان کئی طرح کے فرق کو بیان کیا ہے۔ ان میں زیادہ مشہور یہ ہیں:

نبی وہ ہیں جنہیں کسی بات کی وحی کی گئی لیکن اُسے دوسروں تک پہنچانے کا حکم نہیں دیا گیا اور رسول وہ ہیں جن کے پاس کوئی وحی آئی اور اس کی تبلیغ کا بھی انہیں حکم دیا گیا مثلاً ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۃ العلق نازل ہوئی تو نبوت سے سرفراز ہوئے اور سورۃ المدثر نازل ہوئی تو رسالت سے سرفراز ہوئے۔

یا یہ کہ نبی وہ ہیں جو ما قبل کی شریعت کی تجدید کرتے ہیں اور رسول وہ ہیں جو نئی شریعت کے ساتھ مبعوث ہوتے ہیں۔

یا یہ کہ نبی وہ ہیں جو مومنوں کے درمیان مبعوث ہوتے ہیں، لوگوں کو ان کے دین کی یاددہانی کرتے ہیں۔ کبھی وہ نئی شریعت کے ساتھ بھی مبعوث کئے جاتے ہیں اور رسول وہ ہیں جنہیں کافر قوم کی ہدایت و رہنمائی کے لئے مبعوث کیا گیا ہو۔ ان

---

[1] ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! انبیاء کی کل تعداد کتنی ہے؟ آپ نے فرمایا: انبیاء کی کل تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، ان میں سے تین سو پندرہ رسول ہیں، یہ ایک بڑی تعداد ہے، اس روایت کو شیخ البانی نے مشکاۃ المصابیح میں صحیح قرار دیا ہے۔
ابن حجر کہتے ہیں: انبیاء کی تعداد کے تعلق سے ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث مرفوعاً نقل کی گئی ہے کہ انبیاء کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے، ان میں سے تین سو تیرہ رسول ہیں۔ ابن حبان نے اس روایت کو صحیح کہا ہے۔

کفار میں سب یا کچھ لوگ اس رسول کی مخالفت بھی کرتے ہیں۔ ابن تیمیہ رحمہ نے اپنی کتاب (النبوات) [1] میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

1۔ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنی کتاب "النبوات" میں لکھتے ہیں: نبی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ خبر دیتا ہے، پھر وہ اللہ کی دی ہوئی خبر سے دوسروں کو باخبر کرتا ہے۔ اگر وہ اس کے ساتھ اللہ کے حکم کی مخالفت کرنے والوں کی طرف مبعوث کیا جائے تاکہ ان لوگوں تک اللہ کے پیغام کو پہنچادے تو وہ رسول ہے۔ اگر وہ اپنے پہلے نازل کی گئی شریعت پر عمل کرتا ہے اور کسی کے پاس اللہ کا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری اُسے نہیں دی گئی ہے تو وہ نبی ہے، رسول نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ" (ہم نے آپ سے پہلے جس رسول اور نبی کو بھیجا اس کے ساتھ یہ ہوا کہ جب وہ اپنے دل میں کوئی آرزو کرنے لگا شیطان نے اس کی آرزو میں کچھ ملادیا۔) اللہ تعالیٰ نے اپنے قول (مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ) میں پہلے رسالت کا تذکرہ کیا جو دونوں قسموں کو شامل ہے اور ان میں سے ایک رسالت کے ساتھ خاص کیا۔ اس سے مراد وہ مطلق رسول ہے جسے اللہ نے اپنے مخالفین تک پیغام الٰہی کو پہنچانے کا حکم دیا ہے مثلاً نوح علیہ السلام۔ صحیح میں یہ ثابت ہے کہ وہ زمین والوں کی طرف مبعوث کئے جانے والے سب سے پہلے رسول تھے۔ ان سے پہلے شیث و ادریس علیہما السلام انبیاء ہوئے تھے اور ان دونوں سے پہلے آدم علیہ السلام ہیں جنہیں نبوت بھی ملی اور اللہ سے ہمکلامی کا شرف بھی حاصل ہوا۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے: آدم علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کے درمیان دس صدیوں کا فاصلہ ہے، اس مدت کے دوران تمام انسانی آبادی اسلام پر تھی۔ ان انبیاء کے پاس اللہ کی وحی ان کے کاموں کے سلسلہ میں آتی تھی، پھر وہ اپنے آس پاس کے مومنوں کو ان کاموں کو کرنے کا حکم دیتے تھے کیونکہ وہ مومنین ان انبیاء پر ایمان لانے والے ہوتے تھے۔ ان کا حال ایک شریعت کے پیروکاروں جیسا تھا جو رسول کے حوالہ سے علماء کے پہنچائے ہوئے پیغام کو قبول کرتے ہیں۔ اسی طرح بنو اسرائیل کے انبیاء تھے جو توریت کی شریعت پر عمل کرنے کا لوگوں کو حکم دیتے تھے، ان میں سے کسی نبی کو کسی متعین معاملہ میں بطور خاص وحی بھی کی جاتی تھی، لیکن وہ توریت کی شریعت پر عمل کرانے کے معاملہ میں اس عالم کی طرح تھے جسے اللہ تعالیٰ کسی معاملہ کا فہم عطا کرتا ہے جو قرآن کے مطابق ہوتا ہے جیسا کہ ایک معاملہ کا فیصلہ کرنے کا فہم اللہ نے سلیمان علیہ السلام کو عطا کیا تھا۔ اس معاملہ کو سلیمان و داود اور دونوں مل کر حل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لہٰذا انبیاء وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ باخبر کرتا ہے، انہیں اپنے اوامر و نواہی کے بارے میں بتاتا ہے اور اپنے بارے میں خبر دیتا ہے۔ پھر وہ انبیاء مومنین کو اللہ کی دی ہوئی خبر اور اس کے اوامر و نواہی کے بارے میں بتاتے ہیں۔ اگر انہیں کفار کے بیچ مبعوث کر دیا گیا تو وہ انہیں اللہ کی وحدانیت اور تنہا اس کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ لازمی ہے کہ کچھ لوگ رسول کی تکذیب کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "كَذَٰلِكَ مَا أَتَى الَّذِينَ مِن قَبْلِهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا قَالُوا سَاحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ" (اسی طرح ان سے پہلے کی جس قوم کے پاس کوئی رسول آیا تو ان لوگوں نے کہا کہ یہ کوئی جادوگر ہے یا پاگل ہے۔) دوسری جگہ ارشاد ہے: "مَّا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدْ قِيلَ لِلرُّسُلِ مِن قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَذُو

مَغْفِرَةٍ وَذُو عِقَابٍ أَلِيمٍ "(آپ کو وہی کچھ کہا جارہا ہے جو آپ سے پہلے رسولوں کو کہا جاچکا ہے، بے شک آپ کا رب مغفرت کرنے والا بھی ہے اور دردناک سزا کا مالک بھی ہے۔)(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر) =رسولوں کو اللہ کو نہ ماننے

والوں کی طرف مبعوث کیا جاتا ہے تو کچھ لوگ اسے جھٹلاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:"وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلَّا رِجَالًا نُّوحِي إِلَيْهِم مِّنْ أَهْلِ الْقُرَىٰ ۗ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۗ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِينَ اتَّقَوْا ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ، حَتَّىٰ إِذَا اسْتَيْأَسَ الرُّسُلُ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوا جَاءَهُمْ نَصْرُنَا فَنُجِّيَ مَن نَّشَاءُ ۖ وَلَا يُرَدُّ بَأْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِينَ" (آپ سے پہلے ہم نے بستی والوں میں جتنے رسول بھیجے ہیں سب مرد ہی تھے جن کی طرف ہم وحی نازل فرماتے گئے۔ کہا زمین پر چل پھر کر انہوں نے دیکھا نہیں کہ ان سے پہلے کے لوگوں کا کیسا کچھ انجام ہوا؟ یقیناً آخرت کا گھر پرہیز گاروں کے لئے بہت ہی بہتر ہے، کیا پھر بھی تم نہیں سمجھتے۔ یہاں تک کہ جب رسول ناامید ہونے لگے اور وہ (قوم کے لوگ) خیال کرنے لگے کہ انہیں جھوٹ کہا گیا ہے فوراً ہی ہماری مدد ان کے پاس آپہنچی۔ جسے ہم نے چاہا اسے نجات دی گئی۔ بات یہ ہے کہ ہمارا عذاب گناہ گاروں سے واپس نہیں کیا جاتا) دوسری جگہ ارشاد ہے:" إِنَّا لَنَنصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ آمَنُوا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ الْأَشْهَادُ "(یقیناً ہم اپنے رسولوں کی اور ایمان والوں کی مدد زندگانی نئی دنیا میں بھی کریں گے اور اس دن بھی جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے۔)

اللہ تعالیٰ کا قول(وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ)اس بات کی دلیل ہے کہ نبی بھی مبعوث ہوتا ہے، جب مطلق نبی بولا جائے تو اس سے رسول مراد نہیں ہوگا، اس لئے کہ اُسے ایسی قوم میں مبعوث نہیں کیا جاتا جو اُسے نہ مانتے ہوں بلکہ وہ مومنوں کو ان باتوں کا حکم دیتے ہیں جن سے وہ واقف ہوتے ہیں کہ یہ حق ہے، ان کی مثال عالم کی ہے۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ رسول کے لئے یہ شرط نہیں ہے کہ وہ کوئی نئی شریعت لے کر آئے۔ یوسف علیہ السلام ایک رسول تھے اور وہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت پر تھے۔ داود و سلیمان علیہما السلام بھی رسول تھے اور وہ دونوں توریت کی شریعت پر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آل فرعون کے ایک مومن کے بارے میں فرمایا:" وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُم بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِن بَعْدِهِ رَسُولًا"(اور اس سے پہلے تمہارے پاس یوسف دلیلیں لے کر آئے پھر بھی تم ان کی لائی ہوئی (دلیل) میں شک وشبہ ہی کرتے رہے یہاں تک کہ جب ان کی وفات ہوگئی تو کہنے لگے ان کے بعد تو اللہ کسی رسول کو بھیجے گا ہی نہیں۔)

دوسری جگہ ارشاد ہے:" إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَعِيسَىٰ وَأَيُّوبَ وَيُونُسَ وَهَارُونَ وَسُلَيْمَانَ ۚ وَآتَيْنَا دَاوُودَ زَبُورًا ، وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنَاهُمْ عَلَيْكَ مِن قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ ۚ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا "(یقیناً ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی کی ہے جیسے کہ نوح (علیہ السلام) اور ان کے بعد والے نبیوں کی طرف اور ہم نے وحی کی ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اور عیسیٰ اور ایوب اور یونس اور ہارون اور سلیمان کی طرف اور ہم نے داود کو زبور عطا فرمائی۔ اور آپ سے پہلے کے

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ طاغوت (غیر اللہ) کا انکار کریں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں۔

ابن قیم رحمہ اللہ کہتے ہیں: طاغوت وہ ہے جس کے معاملہ میں بندہ حد سے تجاوز کر جائے، چاہے وہ کوئی معبود ہو یا متبوع (جس کی اتباع کی جائے) ہو یا مطاع (جس کی اطاعت کی جائے) ہو۔

طاغوت بہت طرح کے ہو سکتے ہیں لیکن اصل طاغوت پانچ ہیں: ابلیس ملعون، وہ شخص جس کی عبادت کی جائے اور وہ اس سے راضی ہو، وہ شخص جو لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے، وہ شخص جو کسی طرح کے علم غیب کا دعویٰ کرے اور وہ شخص جو اللہ کی نازل کردہ شریعت کے علاوہ کے ذریعہ حکومت کرے یا فیصلہ کرے۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: " لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ "(دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت سے روشن ہو چکی ہے، اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے۔) کلمۂ توحید "لا الہ الا اللہ" کا یہی مطلب ہے۔ نیز حدیث نبوی کے الفاظ ہیں: "اصل معاملہ اسلام ہے۔ اس کا ستون نماز

بہت سے رسولوں کے واقعات ہم نے آپ سے بیان کئے ہیں اور بہت سے رسولوں کے نہیں بھی کئے اور موسیٰ (علیہ السلام) سے اللہ تعالیٰ نے صاف طور پر کلام کیا۔)

ہے اور اس کا سب سے اعلیٰ عمل اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے"۔ واللہ اعلم وصلی اللہ علی محمد و علی آلہ و صحبہ وسلم۔

اس اقتباس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس میں طاغوت کی تعریف بیان کی گئی ہے، اصلی طاغوتوں کو ذکر کیا گیا ہے، ان کا انکار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، پھر اس رسالہ کو درود وسلام پر ختم کیا گیا ہے۔

جب مصنف رحمہ اللہ نے یہ بتایا کہ رسولوں کی رسالت کا مقصد ایک اللہ کی عبادت کا حکم دینا اور طاغوت کی عبادت سے روکنا ہے تو انہوں نے طاغوت کے بارے میں بھی بتایا۔ پہلے طاغوت کی تعریف بیان کی، پھر اصلی طاغوتوں کو ذکر کیا اور ان کا انکار کرنے کا حکم بیان کیا۔

مصنف رحمہ اللہ کا قول [اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں پر یہ فرض کیا ہے کہ وہ طاغوت (غیر اللہ) کا انکار کریں اور اللہ تعالیٰ پر ایمان لائیں۔]

یہی وہ توحید ہے جس کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:" فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا " اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کر کے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا۔)

شیخ محمد بن عبد الوہاب رحمہ اللہ کہتے ہیں: طاغوت کے انکار میں یہ شامل ہے کہ آپ غیر اللہ کی عبادت کے باطل ہونے کا اعتقاد رکھیں، اس کو چھوڑ دیں، اس سے بغض رکھیں، غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں کو کافر جانیں اور ان سے دشمنی کا رشتہ نبھائیں۔

شیخ سلیمان بن عبد اللہ کہتے ہیں: طاغوت کے انکار میں اس سے بغض رکھنا، اس کو ناپسند کرنا اور کسی بھی شکل میں اس کی عبادت سے راضی نہ ہونا شامل ہے۔[1]

طاغوت لغوی اعتبار سے مبالغہ کا صیغہ ہے جو الطغیان سے مشتق ہے۔ طغیان کے معنیٰ حد سے تجاوز کرنا ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے:" إِنَّا لَمَّا طَغَا ٱلْمَآءُ حَمَلْنَٰكُمْ فِى ٱلْجَارِيَةِ "(جب پانی میں طغیانی آگئی تو اس وقت ہم نے تمہیں کشتی میں چڑھالیا) یعنی پانی جب عام حد سے تجاوز کر گیا تب تم کو کشتی میں سوار کیا۔

طاغوت شرعی اعتبار سے: علماء نے مختلف طریقہ سے اس کی تعریف کی ہے چنانچہ کسی نے اس کا مطلب شیطان، کسی نے جادوگر اور کسی نے کاہن (نجومی) بتایا ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر جس چیز کی بھی عبادت کی جائے وہ طاغوت ہے۔ وغیرہ۔[2]

طاغوت کی مذکورہ بالا تمام تعریف میں یہ بات نظر آتی ہے کہ یہ کسی چیز کی تفسیر اس کے کچھ افراد کے ذریعہ کرنے کے قبیل سے ہے۔ طاغوت کی سب سے جامع تفسیر و تعریف وہ ہے جو ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اعلام الموقعین" میں بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں: طاغوت وہ ہے جس کے معاملہ میں بندہ حد سے تجاوہ کر جائے، چاہے وہ کوئی معبود ہو یا متبوع ہو، یا مطاع ہو۔ تقریباً ہر قوم میں طاغوت کا وجود ہے یعنی وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کے علاوہ کسی اور کو حکم و فیصل مان لیتے ہیں یا اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتے ہیں یا اللہ کی دی ہوئی بصیرت کو نظر انداز کر کے اس کی اتباع کرتے ہیں یا ان باتوں میں اس کی اطاعت کرتے ہیں جن کے بارے میں انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ اللہ کی اطاعت کا کام ہے یا معصیت کا۔ آپ غور کریں گے تو پائیں گے کہ دنیا میں اس قبیل کے طاغوت موجود ہیں۔ آپ جب ان طاغوتوں کے ساتھ لوگوں کے رویہ پر غور کریں گے تو

1۔ الدرر السنیۃ میں ہے: یہ بات معلوم ہے کہ جس نے شرک کا انکار نہیں کیا، توحید کو نہیں پہچانا اور اس پر عمل نہیں کیا وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ (۳/۲۰۷)

2۔ واحدی کے بقول: طاغوت واحد، جمع اور مذکر و مؤنث استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کی آیت:" يُرِيدُونَ أَن يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ" یہ واحد استعمال ہوا ہے اور آیت کریمہ" وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ" میں یہ جمع استعمال ہوا ہے اور آیت کریمہ" وَالَّذِينَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوتَ أَن يَعْبُدُوهَا "میں یہ مؤنث استعمال ہوا ہے۔

دیکھیں گے کہ ان کی اکثریت اللہ کی عبادت سے منحرف ہو کر طاغوت کی عبادت کر رہی ہے، اللہ اور اس کے رسول کو حکم و فیصل ماننے کے بجائے طاغوت کو حکم بنا چکی ہے، اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت و متابعت کو چھوڑ کر طاغوت کی اطاعت و متابعت میں لگی ہوئی ہے۔

ابن جریر طبری طاغوت کے معنیٰ کی وضاحت میں سلف کے متعدد اقوال نقل کرنے کے بعد کہتے ہیں: ان میں میرے نزدیک طاغوت کے سلسلہ میں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ طاغوت وہ ہے جس نے اللہ کے خلاف سرکشی اختیار کی ہو اور اللہ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کی جاتی ہو یا تو اس کے غلبہ و دباؤ کی وجہ سے لوگ اس کی عبادت کرتے ہوں یا اس کی اطاعت کرتے ہوئے لوگ اس کی عبادت کرتے ہوں، وہ باطل معبود چاہے کوئی انسان ہو یا کوئی شیطان ہو یا استھان ہو یا بت ہو یا جو بھی چیز ہو۔

ابن جریر طبری کا یہ قول بھی ہے: آیت " يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوتِ "کی تفسیر میں سب سے صحیح قول یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر دو معبودوں کی عبادت کرتے ہیں اور ان دونوں کو اپنا معبود بناتے ہیں۔

جبت اور طاغوت ان کے دو نام ہیں اللہ کو چھوڑ کر عبادت و اطاعت اور خضوع کے ذریعہ جن کی تعظیم کی جاتی ہے، وہ چاہے جو بھی ہو جس کی تعظیم کی جا رہی ہو، چاہے وہ کوئی پتھر ہو یا انسان ہو یا شیطان ہو۔ جب کسی کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کیا جائے گا تو یہی حکم ہو گا۔ اہل جاہلیت جن بتوں کی پرستش کرتے تھے وہ اس وجہ سے معظم تھے کہ اللہ کو چھوڑ کر ان کی عبادت کی جاتی تھی۔ ان میں جبوت (بت، کاہن، ساحر) بھی تھے اور طواغیت بھی تھے۔ ان میں شیاطین بھی تھے کفار اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے جن کی اطاعت کرتے تھے۔ اسی طرح اُن میں ساحر و کاہن بھی شامل تھے جن کی ہر بات قبول کی جاتی تھی جو وہ اہل شرک کے بارے میں کہتے تھے۔ اسی طرح حیی بن اخطب اور کعب بن اشرف بھی ان میں شامل تھے، اس لئے کہ اللہ کی معصیت اور کفر کے کاموں میں یہود ان کی اطاعت کرتے تھے۔ لہذا یہ دونوں بھی جبت اور طاغوت کی فہرست میں شامل تھے۔

اس اعتبار سے طاغوت کی یہ تین قسمیں ہوئیں:

۱۔ عبات کے طاغوت: اللہ کو چھوڑ کر جس کی بھی عبادت کی جائے اور وہ اس سے راضی ہو تو وہ طاغوت ہے۔

۲۔ اتباع کے طاغوت: ان میں علمائے سوء اور اصحاب سلاسل و طریقت[1] شامل ہیں۔

۳۔ اطاعت کے طاغوت: ان میں وہ سلطان شامل ہیں جو لوگوں کو شریعت مخالف کاموں کو کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

افراد کے اعتبار سے طاغوت کی تعداد بہت زیادہ ہے، لیکن ان سب کے سرغنہ پانچ ہیں جیسا کہ مصنف رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے:

(أ) ابلیس: یہ مطلق طور پر سب سے بڑا طاغوت ہے، اس لئے کہ اس کے اندر طاغوت کی بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں مثلاً وہ لوگوں کو اپنی ذات کی عبادت کی طرف بلاتا ہے، وہ دوسرے کی عبادت کرنے کی بھی دعوت دیتا ہے، وہ اللہ کے احکام کو بدلنے کی دعوت دیتا ہے، وہ علم غیب کا دعوی کرنے والے کی مدد کرتا ہے۔ وہ ان سب کا سرغنہ ہے اس لئے کہ اس کی پرستش کی گئی اور اس لئے بھی کہ وہ متبوع و مطاع (جس کی اتباع و اطاعت کی گئی ہو) ہے اور وہ ان تمام کاموں سے راضی بھی ہے۔

اسلاف میں سے کئی افراد نے منصوص طور پر صراحت کی ہے کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے۔ طبری وغیرہ نے اسلاف کے حوالہ سے اس قول کو نقل کیا ہے۔ جن اسلاف سے یہ قول نقل کیا گیا ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ امام بخاری نے بھی عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے اس قول کو ذکر کیا ہے۔

(ب) وہ جس کی عبادت کی گئی اور وہ اس سے راضی ہو: یہ کسی بھی قسم کی عبادت ہو سکتی ہے مثلاً کسی کے لئے جانور ذبح کیا گیا ہو یا اس سے فریاد کی گئی ہو وغیرہ، وہ چاہے زندہ ہو یا مردہ۔ مصنف رحمہ اللہ کا قول (وھو راض) جملہ حالیہ ہے، لہذا اس میں عیسیٰ علیہ السلام، فرشتے اور وہ لوگ شامل نہیں ہوں گے جو اپنی عبادت سے راضی نہ ہوں۔

ان کے طاغوت ہونے کی دلیل صحیحین میں منقول ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کر کے کہے گا: جو جس چیز کی عبادت کرتا تھا وہ اس کے پیچھے لگ جائے۔ پھر جو

---

1. محمد حنفی کے بارے میں منقول ہے کہ اس نے اپنے مرض موت میں کہا تھا: جس کی کوئی ضرورت ہو وہ میری قبر پر آئے اور اپنی حاجت پیش کرے میں اسے پورا کروں گا۔

سورج کو پوجتا تھا وہ اس کے پیچھے لگ جائے گا، جو چاند کی پرستش کرتا تھا وہ اس کے پیچھے لگ جائے گا اور جو طواغیت کی عبادت کرتا تھا وہ ان کے پیچھے لگ جائے گا۔

اس کی دلیل ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بھی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "قیامت اس وقت تک نہیں آئے گی یہاں تک کہ قبیلہ دوس کی عورتوں کی سرینیں ذوالخلصہ کے آس پاس حرکت کریں گی۔ ذوالخلصہ قبیلہ دوس کا طاغوت تھا جس کی لوگ زمانہ جاہلیت میں عبادت کرتے تھے۔" (صحیح بخاری)

نیز اس کی دلیل عبد الرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم لوگ طاغوتوں اور اپنے آباؤ واجداد کی قسمیں نہ کھاؤ۔" (صحیح مسلم)

(ج) جس نے لوگوں کو اپنی عبادت کرنے کی دعوت دی، اگرچہ اس کی عبادت نہ کی گئی ہو۔ یہ ما قبل سے بھی بڑا طاغوت ہے، اس لئے کہ اس سے قبل کا طاغوت اپنی عبادت سے راضی تھا لیکن اس نے لوگوں کو اپنی عبادت کے لئے نہیں کہا تھا اور اس نے تو اپنی عبادت کی باقاعدہ دعوت دی تو پھر وہ لازمی طور پر اپنی عبادت سے راضی بھی ہو گا۔ اس کی مثال روافض اور صوفیوں کے سرغنہ لوگ ہیں جن کے متبعین شرعی حدود سے آگے بڑھ کر ان کی اتباع کرتے ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر ان کو اپنا متبوع و مطاع بنا لیتے ہیں۔

(د) جس نے کسی طرح کے علم غیب کا دعوی کیا: مثلاً جادوگر، کاہن، نجومی، اور اس قبیل کے لوگ جو غیب کا علم رکھنے کا دعوی کرتے ہیں۔ ان کے طاغوت ہونے کی دلیل جابر رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ طواغیت وہ ہیں جن کے پاس لوگ اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لئے جاتے تھے۔ اس طرح کا ایک شخص قبیلۂ جہینہ میں تھا، ایک شخص قبیلہ اسلم میں تھا، ہر قبیلہ میں اس طرح کا ایک شخص تھا۔ یہ سب کاہن تھے جن پر شیطان اترتا تھا۔ (صحیح بخاری)

غیب: غایب یغیب کا مصدر ہے۔ اس سے مراد وہ بات ہے جو آپ پر مخفی ہو۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

1۔ غیب مطلق: اس سے مراد زمان و مکان کی تمام پوشیدہ باتیں ہیں بایں طور کہ کوئی ہر چیز کو جاننے کا دعوی کرے چاہے وہ جس جگہ ہو۔ یہ دعوی کفر اکبر ہے، اس لئے کہ یہ قدرت اللہ کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ غیب کی ان تمام باتوں سے کسی کو بھی مطلع نہیں کرتا ہے چاہے اس کا مقام و مرتبہ جو بھی ہو بلکہ یہ مطلق علم غیب اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی

خصوصیات میں سے ہے۔ اسی لئے مشہور حدیث جبرئیل میں یہ آیا ہے کہ جب جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: "اس کے بارے میں جس سے دریافت کیا گیا ہے وہ دریافت کرنے والے سے زیادہ علم نہیں رکھتا ہے۔" (متفق علیہ)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "قل لا يعلم من في السماوات والأرض الغيب إلا الله" (کہہ دیجئے کہ آسمان والوں میں سے زمین والوں میں سے سوائے اللہ کے کوئی غیب نہیں جانتا) غیب کی کچھ باتیں جو ماضی، حال یا مستقبل سے تعلق رکھتی ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے بتا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "عالم الغيب فلا يظهر على غيبه أحدا إلّا من ارتضى من رسول" (وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا سوائے اس پیغمبر کے جسے وہ پسند کرلے)

اس کے بعد جو شخص یہ دعوی کرے یہ ولی زمین کی ہر چیز کو جانتا ہے یا شہر کی ہر چیز کو جانتا ہے یا دلوں کا حال جانتا ہے تو وہ ملت اسلام سے خارج ہو گیا۔ العیاذ باللہ

مثلاً کچھ لوگ اس طرح کی کفریہ بات کہتے ہیں: قاہرہ میں ایک کیل بھی گاڑی جاتی ہے تو سید بدوی کو اس کا علم ہوتا ہے۔

2۔ غیب نسبتی: مثلاً ایسی بات جو کچھ لوگوں سے مخفی ہو جبکہ دوسرے لوگ اسے جانتے ہوں۔ جسے وہ بات معلوم نہیں ہے اس کے لئے وہ غیب ہے لیکن جسے معلوم ہے اس کے لئے غیب نہیں ہے بلکہ آنکھوں دیکھی چیز ہے۔ اس طرح کی باتوں پر غیب کا اطلاق بطور مجاز ہوتا ہے۔

(ھ) وہ شخص جس نے اللہ کی نازل کردہ شریعت کے علاوہ کے ذریعہ فیصلہ یا حکومت کیا۔

مخلوقات پر حاکمیت اللہ تعالیٰ کی خصوصیات میں سے ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "إن الحكم إلّا لله" (حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے)

اس کی دلیل کہ یہ قسم بھی طاغوت میں شامل ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: "يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به" (وہ اپنے فیصلے غیر اللہ کی طرف لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ انہیں حکم دیا گیا ہے کہ شیطان کا انکار کریں)

اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے علاوہ کے ذریعہ فیصلہ کرنے کے معاملہ میں تفصیل ہے۔ کبھی یہ عمل کفر اکبر ہوتا ہے اور کبھی کفر اصغر ہوتا ہے:

(أ) کفر اکبر: یہ عمل کفر اکبر تب ہوگا جب کوئی شخص اللہ کی نازل کردہ شریعت کے علاوہ کے ذریعہ فیصلہ کرے اور اس کا یہ اعتقاد ہو کہ یہ اللہ کے حکم سے زیادہ بہتر ہے یا اس کے برابر ہے یا یہ سمجھے کہ اس کے ذریعہ فیصلہ کرنا بھی جائز ہے چاہے وہ اللہ کے حکم کو افضل سمجھتا ہو یا وہ اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے کو استخفافاً ترک کردے، اسے حقیر سمجھتے ہوئے یا یہ اعتقاد رکھتے ہوئے کہ یہ لوگوں کے لئے زیادہ مناسب اور فائدہ مند ہے۔

(ب) کفر اصغر: یہ عمل کفر اصغر تب ہوگا جب کوئی شخص اللہ کی شریعت کے علاوہ کے ذریعہ فیصلہ کرے لیکن وہ جانتا ہو کہ اس کا یہ عمل باطل اور ناجائز ہے، اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ کرنا اور حکومت کرنا اس پر واجب ہے لیکن اس نے محکوم کا خیال کرکے یا اس کے خوف سے یا اس سے رشوت وصول کرنے کے لئے اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا۔

اس مسئلہ کی مزید وضاحت "نواقض الإسلام" کی شرح میں کی جائے گی إن شاء اللہ۔

فائدہ: مصنف رحمہ اللہ نے یہاں پر طواغیت کے سرغنہ کی تعداد پانچ بتائی ہے، پھر انہیں شمار بھی کیا ہے۔ کچھ جگہوں پر ان کے علاوہ شکلوں کو طواغیت میں شمار کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی کوئی حتمی تعداد یا شکل نہیں ہے۔ لیکن انہوں نے جو کچھ ذکر کیا ہے وہ صحت سے زیادہ قریب ہے۔ واللہ اعلم [1]

---

[1] ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ ان طاغوتوں میں سے پانچ ہمارے لئے ظاہر وعیاں ہیں۔ ان میں سب سے پہلا شیطان ہے، پھر ظلم کرنے والا حاکم، رشوت خور، وہ جس کی عبادت کی جائے اور وہ اس سے راضی ہو اور علم کے بغیر عمل کرنے والا (الدرر السنیۃ (1/137)) اسی کتاب میں (ص 162-163) پر انہوں نے طاغوتوں کو اس طرح ذکر کیا ہے: شیطان، ظلم کرنے والا حاکم، اللہ کی شریعت کے علاوہ کے ذریعہ فیصلہ کرنے والا، جو علم غیب کا دعوی کرے اور اللہ کو چھوڑ کر جس کی عبادت کی جائے اور وہ اس سے راضی ہو۔

مصنف رحمہ اللہ نے رسالہ کے اختتام پر کہا ہے [حدیث میں آیا ہے کہ تمام معاملات کی اصل اسلام ہے، اس کا ستون نماز ہے اور اسلام کا سب سے اعلیٰ مظاہرہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا ہے]

مصنف رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ کے اختتام پر معاذ رضی اللہ عنہ سے منقول حدیث نقل کی ہے جسے امام احمد، امام ترمذی اور امام ابن ماجہ نے نقل کیا ہے اور شیخ البانی نے اسے صحیح کہا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (رأس الأمر) سے یہاں دین مراد ہے۔ اور اسلام سے یہاں پر توحید و رسالت کی شہادت دینا مراد ہے۔ امام احمد نے معاذ رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: اگر چہ تم چاہو تو میں تم کو بتاؤں کہ اس معاملہ کی اصل کیا ہے، اس معاملہ کا ستون کیا ہے اور اس کا سب سے اعلیٰ مرتبہ کیا ہے۔ میں نے عرض کیا: کیوں نہیں، آپ ضرور بتائیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس معاملہ کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ اکیلا و تنہا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور محمد اس کے بندہ اور رسول ہیں۔

ابن رجب کہتے ہیں: امر سے مراد وہ دین ہے جس کے ساتھ آپ کی بعثت ہوئی، یعنی اسلام۔ دوسری روایت میں اس کی وضاحت شہادتین سے کی گئی ہے۔ جس شخص نے ان دونوں شہادتوں کا ظاہری و باطنی طور پر اقرار نہیں کیا تو اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد (عمودہ الصلاۃ) عمود خیمہ کے کھمبے کو کہتے ہیں جس پر وہ کھڑا ہوتا ہے۔ اگر وہ کھونٹا گر جائے تو خیمہ گر جاتا ہے۔ اسی طرح نماز دین کا ستون ہے۔ جو شخص نماز نہیں پڑھتا اس کا کوئی دین نہیں ہے۔ اس سے تارک نماز کے کافر ہونے کی تائید ہوتی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد (وذروۃ سنامہ الجھاد في سبیل اللہ) ذروۃ کسی چیز کی بلندی کو کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد دین کا سب سے اعلیٰ مرتبہ ہے۔ ایسا اس لئے کہ جہاد کی وجہ سے دین کو سربلندی حاصل ہوتی ہے اور جہاد کو ترک کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کو ذلت و اہانت ہاتھ آتی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون" (تم لوگ اپنے کو کمزور نہ سمجھو اور نہ غم کرو، تم ہی سربلند ہو)

صحیحین میں ابوذر رضی اللہ عنہ کی روایت منقول ہے کہ میں نے دریافت کیا: اے اللہ کے رسول! کونسا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔ یہاں پر اس مفید رسالہ کا اختتام ہوتا ہے۔ مصنف رحمہ اللہ نے اسے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام پر ختم کیا ہے اور علم کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف لوٹایا ہے۔

ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں قول و عمل میں اخلاص اور دین کا تفقہ عطا فرمائے اور ہمیں توحید پر ثابت قدم رکھے۔ آمین، آمین، آمین۔